

بہار اودھ

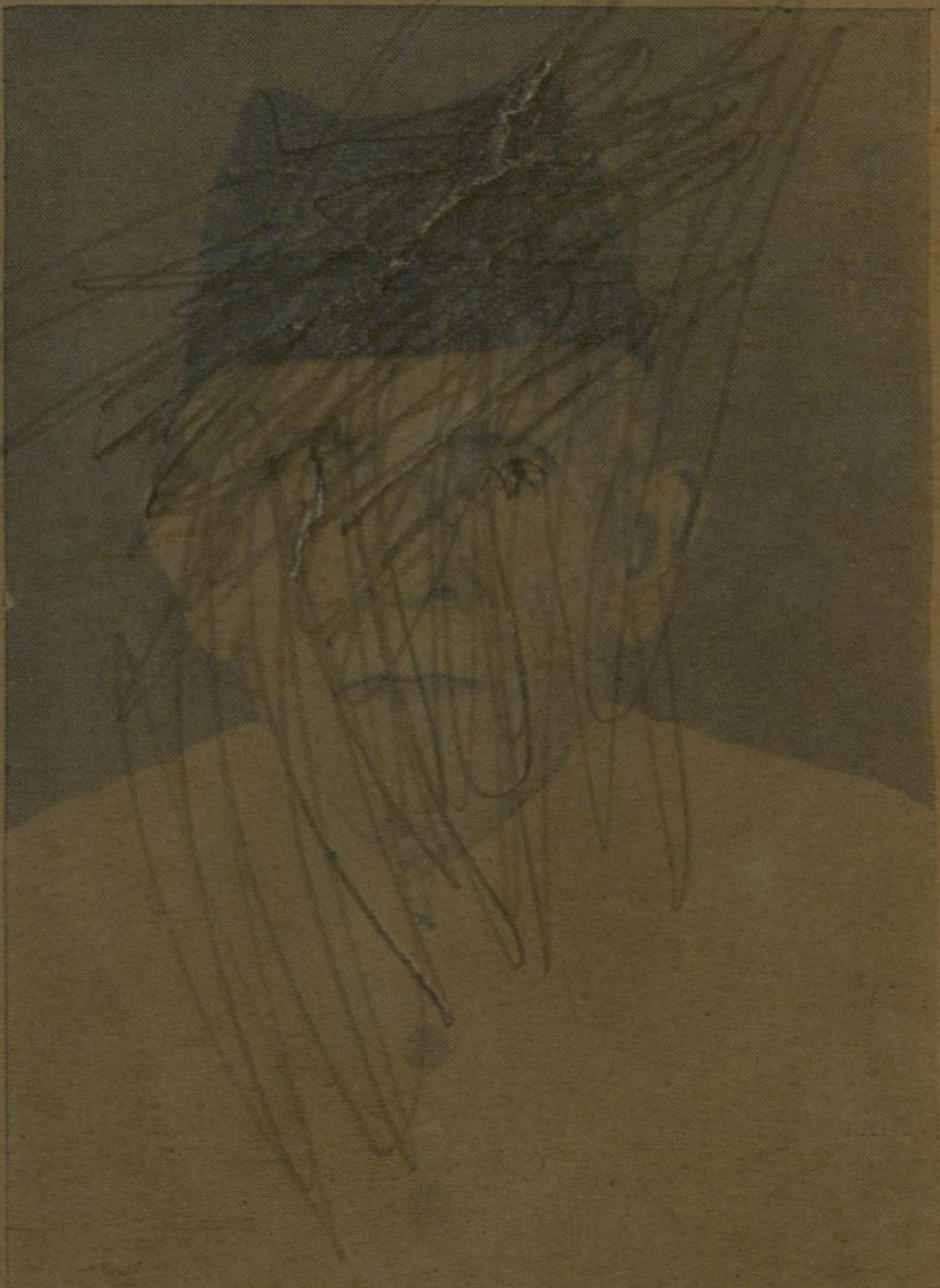
بالتصویر

بہار اودھ.

از

محمد غوث الدین علوی

فہرست



محمد غوث الدین مصنف کتاب ھذا

۷۸۶

بہارِ اودھ

باتصویر

تاجدارانِ اودھ قدیم لکھنؤ
باکمال اہلِ فن و اہلِ ہنر اور
کے تاریخی حالات

مصنفہ محمد غوث الدین علوی
(لکھنوی)

دسمبر ۱۹۶۶ء

بار اوّل

قیمت ~~دو روپے پچیس پیسے~~

تین روپے

ملنے کا پتہ

F/۲۳۷ بھابھڑہ خانہ راولپنڈی

مصنف محمد غوث الدین علوی نے ہمدرد اسٹیم پریس راولپنڈی
میں چھپوا کر شائع کی

پیش لفظ

میں کتاب ہذا کے مصنف جناب محمد غوث الدین صاحب علوی (مولوی محمد مسیح الدین صاحب خان بہادر کے پر پوتے) کے جذبہ کی دلی قدر کرتا ہوں کہ اُنھوں نے لکھنؤ کے مخلص شہری ہونے پر شاہانِ اودھ سے وفاداری کے جذبہ میں شاہانِ اودھ اور لکھنؤ کے کماحقہٗ واقعات وحالات کو اس طرح سے تدوین کیا ہے کہ اس قدر مواد کسی اور کتاب میں ملنا ناممکن ہے اور جتنے واقعات لکھے ہیں وہ صحیح اور مصدقہ ہیں اور برطانیہ کے حکمرانان بالا نے شاہانِ اودھ خصوصاً سلطانِ عالم واجد علی شاہ کے متعلق جو کردہ پروپیگنڈا کیا تھا اس کا ازالہ کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ یہ سب غلط اور محض افترا تھا اور جو کچھ قلمبند کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان پر مصنف ممدوح کو پورا عبور ہے۔

المرقوم سید ذاکر حسین عابدی
نواسہ سرکار نجم العلماء مولانا سید نجم الحسن
صاحب قبلہ مجتہد اعلی اللہ مقامہٗ لکھنوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ حال

بعض مورخین نے شاہانِ اودھ پر عیش پرستی اور اسراف بے جا کے الزامات عائد کئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اکثر بادشاہوں نے روپیہ پانی کی طرح بہایا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس سے بے شمار مخلوق کو فائدہ پہنچا اور بہتوں کی زندگیاں بن گئیں اور ملک کی دولت ملک ہی میں رہی اس سے انتظامی امور اور رفاہِ عام کے کاموں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ یہ تو بالکل ناممکن ہے کہ فراوانیٔ دولت کے ہوتے ہوئے ہر وہ شخص جس کے ہاتھ میں عنانِ حکومت ہو اعتدال کی حد سے آگے نہ بڑھے البتہ جمہوری دور میں اس کی گنجائش نہیں۔

ایک مدت سے یہ خیال تھا کہ اودھ کی ایسی تاریخ لکھوں جس میں تاجدارانِ اودھ اور ان کے طرزِ حکومت اور اس وقت کی خوشحالی نیز اودھ کے اہلِ فن اور اہلِ ہنر کا تذکرہ ہو۔ اودھ کی آغوشِ سلطنت میں جتنے ہنر اور ہنرمندوں نے پرورش پائی اور ہر فن اور ہنر میں کمال حاصل کیا ان کا مکمل سراغ کسی کتاب سے نہیں ملتا پھر بھی جو کچھ لکھا گیا اس سے زیادہ لکھا جا سکتا تھا۔ اختصار کے پیشِ نظر چند اہلِ فن اور اہلِ ہنر کا تذکرہ کر دیا گیا ہے۔

اس کتاب کی ترتیب درج ذیل کتب سے اور سینہ بہ سینہ اپنے بزرگوں سے جو حالات اور واقعات معلوم ہوئے جن کا قریبی تعلق خلد آشیان حضرت سلطان عالم اور خاندانِ شاہی سے رہ چکا تھا کی گئی ہے

(۱) سفرنامہ لندن مرتبہ مولوی محمد مسیح الدین خان بہادر مطبوعہ للناظر پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ (۲) تذکرہ مشاہیر کاکوری مولفہ مولانا حافظ محمد علی حیدر صاحب علوی مطبوعہ اصح المطابع وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۱۹۲۷ء (۳) قیصر التواریخ مصنفہ سید کمال الدین حیدر مطبوعہ مطبع منشی نولکشور لکھنؤ (۴) حیات مولانا کرامت حسین مولفہ حامد علی خان بیرسٹر ایٹ لا مطبوعہ نور المطابع نخاس لکھنؤ (۵) بوستان اودھ فارسی مصنفہ راجہ درگا پرشاد صاحب سندیلوی مطبوعہ مطبع دبدبہ احمدی لکھنؤ ۱۸۹۲ء (۶) فسانہ عبرت مصنفہ رجب علی بیگ سرور مطبوعہ مطبع نجم العلوم کارنامہ لکھنؤ (۷) تاریخ سندیلہ مصنفہ راجہ درگا پرشاد صاحب مطبوعہ کارونیشن پریس حسن گنج لکھنؤ (۸) تاریخ اودھ مولفہ حکیم نجم الغنی خان مطبوعہ مطبع منشی نولکشور لکھنؤ (۹) لائف علامہ کنتوری مطبوعہ خادم التعلیم اسٹیم پریس لاہور (۱۰) دربار اودھ (۱۱) افضل التواریخ (۱۲) سوانح عمری مرزا محمد کاظم (۱۳) وقائع دلپذیر (۱۴) مضامین شرر یہ ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گذشتہ لکھنؤ مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور (۱۵) تذکرہ کاملان رام پور مولفہ حافظ احمد علی خان شوق مطبوعہ ہمدرد پریس دہلی ۱۹۱۹ء (۱۶)

THE MASNAD OF MURSHIDABAD-1704-1904, BY P.C. MUJAMDAR KUNTALINE PRESS CALCUTTA

FIRST TWO NAWABS OF OUDH BY ASHINBADI (?) LAL, M.A. UPPER INDIA PUBLISHING HOUSE LUCKNOW

۲۰ نومبر ۱۹۶۶ء — محمد خوش نشاء الدین علوی لکھنوی

باغِ ہند

زراعت میں صوبہ اودھ ہمیشہ سے زرخیز ہے۔ معتدل آب و ہوا موزوں بارش کی وجہ سے یہاں ہر قسم کا غلہ پیدا ہوتا ہے مثلاً گیہوں چاول، جو، چنا، جوار، باجرا، دالیں وغیرہ۔ بیش قیمت فصلیں روئی افیون۔ نے شکر، تربوز، ہر قسم کی ترکاریاں یہاں کا مائیہ ناز سرمایہ ہے اناؤ میں اعلیٰ درجہ کے چاول پیدا ہوتے ہیں۔ لکھنؤ کے سفیدے خربوزے اور انواع و اقسام کے آم تمام ہندوستان میں مشہور ہیں۔ ایسے خربوزے اور آم ہندوستان بھر میں کہیں نہیں ہوتے اور یورپ تک جاتے ہیں۔ لکھنؤ کو باغِ ہند کہا جاتا ہے۔ صنعت و حرفت میں بھی یہ ممتاز رہا ہے۔

سترھویں صدی عیسوی میں دریاآباد اور خیرآباد کے کپڑوں کی فروخت کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہاں کارخانہ قائم کیا تھا سوتی کپڑے یہاں کے دور دور مشہور تھے۔ خوبصورت نواڑ اور پرانی روئی کی خوشنما مضبوط دریاں بنتی ہیں۔ سوتی کپڑے اور پلنگ پوش لندن جاتے تھے۔ دولت مند تاجر بھرے پڑے تھے جو دستکاری کی چیزیں باہر بھیجتے تھے۔ چکن۔ کامدانی۔ کارچوب۔ کلابتون۔ ہاتھی دانت کا کام۔ مرصع طلائی و نقرئی زیورات و ظروف طلائی و نقرئی ورق۔ عطر۔ اگربتیاں۔ حقے پیچوان جس نفاست و عمدگی سے بنائے جاتے تھے ہندوستان میں کہیں ان کا جواب نہ تھا۔ شالی رومال۔ قبا شال دوشالوں کا اتنا رواج تھا کہ ہزاروں شال بننے والے رفوگر اور

شال بننے والے کشمیر چھوڑ کر یہاں آباد ہو گئے۔ رنگ ساز و رنگ ریز ایسے صناع تھے کہ جو پھول کہئے کپڑے پر رنگ کے تیار کر دیں۔ ہار سنگھار کے پھولوں کی ڈنڈیوں سے زعفرانی رنگ تیار کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ درجہ کا لکڑی (کاٹھ) کا کام بنتا تھا۔ فیض آباد کے صندوقچے تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ کپڑے پر پھول گلدستے بنانے کے چھاپے۔ کھڑاویں اور لاتعداد چیزیں بنتی تھیں۔ بے مثال مُہر کن اور روشنائی ساز تھے۔ آتشباز لاجواب آتش بازی تیار کرتے تھے۔ بٹیروں کی خوشنما کابکیں اور چڑیاں پالنے کے خوبصورت پنجرے پنکھے۔ بید کے بکس بنتے تھے۔ ظروف گلی بچوں کے کھلونے اور ہر قسم کے پھل لکھنئو کے ایسے کہیں نہ بن سکے۔ مٹی کے پھلوں کو اصلی پھلوں میں ملا کے رکھا جائے تو پہچاننا مشکل ہو جائے۔ گھر کی بیٹھنے والی شریف مستورات چکا۔ ٹھپا۔ چٹکی۔ بنت۔ ٹوپی۔ بیلیں۔ تار کشی۔ اعلیٰ درجہ کی بناتی تھیں جسکا خاطر خواہ معاوضہ ملتا تھا۔ اچار چٹنی مربّے پھلوں کے شربت۔ اور آٹا دُھ کے پیڑے سندیلہ کے لڈّو دُور دُور جاتے تھے۔ بعض ایسے کاریگر تھے جو دہلی کی وضع کے بہت ہلکے اور خوشنما جوتے بناتے تھے جسکا وزن پانچ چھ تولہ سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ گرمیوں کے لئے کاشانی مخمل کے برسات کے لئے کیمخت کے کیمخت بنانے کے بہت سے کارخانے جاری ہو گئے۔ سلمہ ستارے کارچوبی کام کے جوتوں میں بہت ترقی ہوئی انکی مانگ اتنی بڑھی کہ آبادی کا ایک معتدبہ حصہ انکی تیاری پر بسر کرنے لگا۔

لکھنؤ کا غدر کے مورخ کا بیان ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے لکھنؤ تجارت

کا سب سے بڑا مرکز تھا خصوصاً شمالی ہندوستان میں تجارتی منڈی اتنی بڑی کہیں نہ تھی۔ لکھنؤ کے دستکار ہر قسم کی اشیا نہایت عمدگی اور نفاست سے تیار کرتے تھے۔ یہاں علم و ہنر کے ہر صیغہ کو کمال کی حد تک پہنچا دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔

لکھنؤ شاہی عہد میں

شاہ غازی الدین حیدر و نصیر الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ بام عروج پر پہونچ چکا تھا لیکن سلطان عالم واجد علی شاہ کے عہد میں رشک جہاں بنا ہوا تھا۔ غدر کی پامالی سے پہلے اس کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ شہر کی وہ خوبصورتی وہ رونق وہ شان و شوکت اب کہاں جو اس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کثیر آبادی تھی کوچہ و بازار میں آدھی رات تک چہل پہل رہتی تھی کندھے سے کندھا چھلتا تھا۔ چینی بازار میں رات کو شیشہ آلات کی دکانیں آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتی تھیں۔ گول دروازے سے رومی دروازے تک جوہریوں کی دکانوں پر سیم و زر کے انبار مرصع بجواہر زیورات پر نگہہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ نادر و نایاب گھوڑے ران سواریوں اور گاڑیوں میں دیکھنے میں آتے تھے جنکی تصویر کھینچ لینے کو جی چاہتا تھا۔ طلائی و نقرئی زیورات اور مخملی کارچوبی جھولوں سے آراستہ کوہ پیکر ہاتھی جن پر گنگا جمنی ہودے کسے ہوتے تھے امرا کے تزک و احتشام کو دوبالا کرتے تھے۔ اسوقت لکھنؤ میں علماء۔ فضلاء۔ شعراء۔ عالی ظرف۔ عالی حوصلہ۔ سخی۔ دریا دل۔

قدردان۔ وضعدار۔ باوفا۔ خوش خلق۔ شائستہ۔ فہمیدہ۔ باغیرت نفاست پسند اور باکمال اہلِ ہنر کا مسکن تھا۔ انہیں گوناگوں خوبیوں نے اسے ہندوستان بھر میں مشہور کر دیا تھا۔ یہ ہندوستان کا عروس البلاد تھا۔ یہ علم و ادب اور بہت سے فنون کا مرکز و منبع تھا۔ یہ مملکتِ ہند کا بے خزاں گلستان تھا جسکے چمن سدا بہار تھے۔ یہاں اکنافِ ہند سے آئے ہوئے لوگوں کی بگڑی بنتی تھی نادار آتے اور تونگر ہو جاتے۔ قدم رکھتے ہی غمگین شاد و شگفتہ ہو جاتے۔ معطر کوچہ و بازار مشامِ جان کو فرحت و تازگی بخشتے۔ اس چمن کے نقشہ میں جہاں ہر رنگ میں بہار کا ثبات تھا۔ جہاں لالہ و گل نسرین و نسترن کے جدا جدا رنگ پر لوگ چڑھتے نہیں تھے خوش ہوتے تھے ہندو مسلمان شیر و شکر تھے مسجدوں میں صدائے اللہ اکبر اور مندروں میں ناقوس کی صداؤں سے لوگ چیں بہ جبیں نہیں ہوتے تھے رہنا سی باغ کی دل فریبیاں سکندر باغ کی رعنائیاں دل کشا کی سحر کاریاں۔ ولایتی باغ کی دل آویزیاں موتی محل کی دلربائیاں۔ قیصر باغ کی رنگینیاں عیش باغ کی وجد آفرینیاں یکار بیکار کے کہتی تھیں ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است ٭ ہمین است و ہمین است و ہمین است

نواب سعادت خان برہان الملک

از سنہ ۱۷۲۴ء تا ۱۷۳۹ء

نام میر محمد امین تھا سلطنت اودھ کے بانی تھے۔ جواہرات کی

تجارت کرتے تھے۔ سنہ ۱۷۰۵ء میں نیشاپور ایران سے وارد ہندوستان ہوئے
ذی علم ہونے کے ساتھ صانع قدرت نے انہیں بہت سی صلاحیتیں عطا کی
تھیں اعلیٰ درجہ کے ناظم اور دُور اندیش مدبر تھے۔ انہیں خوبیوں کی بدولت
شہنشاہِ دہلی کے دربار میں رسائی ہوئی کارہائے نمایاں انجام دیئے اور
جلدی ہی مقربان خاص میں شمار ہونے لگے اعلیٰ قابلیت سے متاثر ہو کر
اُمرائے ایران نے انکو اپنا رہنما بنالیا۔ دربار سے بیانہ کی فوجداری ملی
ساداتِ بارہہ کے خلاف شہنشاہ سے وفاداری کے صلہ میں منصب
پنج ہزاری مع خلعت عطا ہوا اور نواب بُرہان الملک کے خطاب سے
سرفراز ہوئے۔ دو سال آگرہ کے صوبہ دار رہے سنہ ۱۷۲۴ء میں اودھ کے
صوبہ دار بنائے گئے۔ اس صوبہ کی حدود شمال میں نیپال دکن میں بندیل کھنڈ
مشرق میں صوبہ بہار اور مغرب میں روہیل کھنڈ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے
اجودھیا فیض[۱] آباد کو اپنا مستقر قرار دیا جہاں انہوں نے ایک قلعہ بھی بنوایا
محاصل میں ایسا اضافہ کیا کہ کسی کو تکلیف نہ ہو سرکشوں کی سرکوبی کی اور
پورے صوبہ میں امن وامان بحال کر دیا اور شمالی ہند کے اس اہم ترین صوبہ
کو تیزی سے ترقی کی راہ پر لگا دیا۔ برہان الملک کی اولاد نرینہ نہ تھی سنہ ۱۷۲۳ء
میں انہوں نے اپنی بیٹی صدر النساء کا عقد اپنے چھوٹے بھتیجے نواب ابوالمنصور
خان صفدر جنگ سے کر دیا اور اپنا نائب و جانشین مقرر کیا۔
۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملہ کے وقت اسکی فوج سے کرنال میں مقابلہ کیا
جس میں بوجوہات شکست ہوئی۔ اسکے بعد آغاز ۱۷۳۹ء میں بمقام دہلی زہر
سے ان کا انتقال ہوا۔

۱؎ فیض آباد کو اس وقت بنگلہ بھی کہتے تھے ۱۲

لکھنؤ میں انہوں نے پانچ محل اور مبارک منزل بنوائی۔

نواب ابوالمنصور خان صفدر جنگ

۱۷۳۹ء تا ۱۷۵۴ء

برہان الملک کے انتقال کے بعد انکے دو بھتیجوں نواب شیر جنگ اور نواب صفدر جنگ میں اقتدار کی نزاع پیدا ہوئی۔ دونوں نے نادر شاہ کی موجودگی میں اودھ کی صوبہ داری کی درخواست کی۔

صفدر جنگ اپنے بھائی سے زیادہ قابل تھے اور برہان الملک کے داماد بھی تھے انہوں نے بیس لاکھ اشرفیاں نذر میں پیش کیں چنانچہ انہیں کو برہان الملک کا جانشین تسلیم کر لیا گیا۔

صفدر جنگ نے اپنے دور حکومت میں مختلف اصلاحات کا نفاذ کیا۔ فیض آباد میں فوجی چھاؤنی قائم کی، اور لکھنؤ میں قلعہ مچھی بھون اور قلعہ جلال آباد بنوایا۔

انہوں نے ۱۷۵۴ء میں بعارضہ بخار انتقال کیا اور دہلی میں دفن ہوئے۔ وہاں ان کا عالی شان مقبرہ صفدر جنگ کے مقبرہ کے نام سے مشہور ہے۔

نواب شجاع الدولہ

از ۱۷۵۴ء تا ۱۷۷۵ء

خلف نواب ابوالمنصور خان صفدر جنگ اپنے والد کے

جانشین ہوئے۔

پٹنہ میں شاہ عالم ثانی نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور نواب شجاع الدولہ کو وزیر مقرر کر کے وزیر الممالک کے خطاب سے سرفراز کیا۔ اس وقت سے فرمانروایانِ اودھ نواب وزیر کہلانے لگے۔

شجاع الدولہ نے مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت اور خطرے سے احمد شاہ ابدالی کو آگاہ کیا اور ایک متحدہ قوت کے ساتھ مرہٹوں سے مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی۔ شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ کی متحدہ افواج نے پانی پت کے تاریخی میدان میں مرہٹوں کی بہت بڑی فوج کو شکست فاش دی جو پانی پت کی آخری لڑائی کے نام سے مشہور ہے۔

نواب ناظم بنگال و بہار میر قاسم نے جب اضلاع مدنا پور۔ چوبیس پرگنہ (کلکتہ) اور چٹاگانگ ایسٹ انڈیا کمپنی کو تفویض کر دیئے تو ان کو انگریزوں سے دائمی خطرہ پیدا ہو گیا اور دارالحکومت مرشد آباد سے مونگیر (بہار) منتقل کر دیا۔ والی اودھ سے انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے پر اصرار کیا جو خود بھی انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اس لئے وہ بھی آمادہ ہو گئے۔

۱۷۶۴ء میں نواب ناظم اور شجاع الدولہ کی متحدہ فوج نے بمقام بکسر (بہار) لارڈ کلائیو کی انگریزی فوج سے مقابلہ کیا (اس فوج میں تین ہزار گورے اور ساڑھے تین ہزار ہندوستانی سپاہی تھے) سخت لڑائی کے بعد متحدہ فوج کو شکست ہوئی۔ نواب کے چند

افسر انگریزوں سے مل گئے تھے۔ شجاع الدولہ نے انگریزوں سے صلح کرلی۔ اُس وقت سے اودھ کی خودمختاری پر زوال شروع ہوا۔ میر قاسم میدان جنگ سے لاپتہ ہو گئے۔ اور عالم عسرت میں بمقام دہلی ۱۷۷۷ء میں انتقال کیا اور ایک شال بیچ کر ان کی تجہیز و تکفین کی گئی۔

شجاع الدولہ کو انگریزوں سے شکست کا بدلہ لینے کی آرزو تھی چنانچہ اُنہوں نے ناقابل اعتماد افسروں کو برطرف کیا اور فوج کو ازسرِ نو منظم کیا۔

انہیں دنوں الٰہ آباد کے سنگم پر اہل ہنود کا متبرک نہان تھا مہاراجہ سندھیا کی آمد تھی۔ شاہی انتظامات تھے۔ شجاع الدولہ ان سے ملنے الٰہ آباد گئے۔ مہاراجہ سے پگڑی بدلی۔ بڑھتے ہوئے انگریزی اقتدار پر گفتگو کی۔ مہاراجہ نے انگریزوں سے لڑنے کی صلاح نہیں دی اور نواب عالی کو حکمتِ عملی سے کام لینے کا مشورہ دیا لیکن نواب انگریزوں سے ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ مہاراجہ سندھیا سے مایوس ہو کر اُنہوں نے ملہار راؤ ہلکر سے سلسلہ جنبانی کی اور اپنا شریک کار بنا لیا۔ دوران سفر ہلکر فوج کے اخراجات چالیس ہزار یومیہ اور بحالتِ قیام و جنگ کی صورت میں ساٹھ ہزار یومیہ نواب نے ادا کرنا منظور کیا۔

بمقام کڑہ مانک پور شجاع الدولہ اور ہلکر کی متحدہ فوج انگریزوں کے مقابلہ میں صف آرا ہوئی میدانِ کارزار میں گھمسان کا رن پڑا گولہ باری کے دھوئیں اور گرد و غبار سے مطلع تیرہ و تار ہو گیا۔ طرفین کا بہت نقصان ہوا۔ بالآخر اس دفعہ بھی انگریزوں کو فتح نصیب ہوئی۔ میدان جنگ میں

شجاع الدولہ گھوڑے پر سوار تھے اور ساتھ مہاراجہ ہلکر پالکی میں۔ جب شکست کی خبر ان دونوں نے سُنی تو جذبہ غیظ و غضب میں مہاراجہ تلوار لیکر پالکی سے اُترنے لگے۔ وقت بہت نازک تھا۔ نواب نے مہاراجہ کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

شجاع الدولہ نے الہ آباد جا کر انگریزوں سے صُلح کر لی۔ گویا اودھ کی کامل آزادی ختم ہوگئی۔

اِس عارضی صُلح کے بعد تین اعلیٰ انگریز افسر کلکتہ سے فیض آباد آئے اور ایک عہد نامہ شجاع الدولہ کے سامنے پیش کیا جس میں منجملہ دیگر دفعات کے ایک دفعہ بُرے وقت میں ایک دوسرے کے کام آنے کی تھی۔ ایک دفعہ فوج کی تعداد گھٹا کر پینتیس ۳۵ ہزار کرنے کی۔ اور ایک دفعہ دربار اودھ میں ایک انگریز رزیڈنٹ مقرر کرنے کی۔ یہ بھی لکھا گیا کہ فریقین اور انکے جانشین ہمیشہ اس عہد نامہ کی پابندی کرینگے۔ اور آئندہ کبھی اس میں کسی تبدیلی کا مطالبہ نہ کرینگے۔ درمیان میں قرآن اور انجیل رکھکر اس عہد نامہ پر فریقین نے دستخط کیے اور زبانی بھی دوستی کے عہد و پیمان ہوئے۔

نواب شجاع الدولہ نے بعارضہ تپ ۱۱۸۸ھ میں انتقال کیا اور گلاب باڑی فیض آباد میں دفن ہوئے۔

نواب آصف الدولہ

از ۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء

نام محمد یحییٰ تھا۔ اپنے والد نواب شجاع الدولہ کے بعد سریر آرائے

سلطنت ہوئے سرزمین لکھنؤ کی طلسمی کشش سے دار السلطنت لکھنؤ لے آئے۔ بڑے دریا دل۔ اولوالعزم اور سخی تھے۔ نئے دار السلطنت کی تعمیر اور اُسے آراستہ کرنے میں پانی کی طرح روپیہ صرف کیا اور لکھنؤ کو ہندوستان کا عروس البلاد بنا دیا۔

شروع بیسویں صدی تک لوگ انکی سخاوت سے اتنے خوش اعتقاد تھے کہ اکثر دکاندار دکان کھولتے وقت کہتے تھے "جسکو نہ دے مولیٰ اُسے دلوائیں آصف الدولہ"

کچھ عرصہ بعد کمپنی کے دوسرے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کلکتہ سے لکھنؤ آئے اور نواب سے چھہتر لاکھ روپے کی اشد ضرورت بیان کی نواب نے فوری ادائی سے معذوری ظاہر کی ہسٹنگز نے کہا کہ کمپنی سرکار کو اسوقت روپے کی فوری ضرورت ہے ایسے موقع پر آپکو آبائی دولت کو ہاتھ لگانا بے محل نہ ہوگا۔ نواب نے جواب دیا آبائی دولت میری دادی اور والدہ کے پاس فیض آباد میں ہے ان سے طلب کرنے سے معذور ہوں ہسٹنگز نے رقم مذکور بیگمات سے طلب کرنے کی اجازت مانگی۔ نواب نے مجبوراً کہا کہ وہ دیں تو لے لیجئے۔ ہسٹنگز فیض آباد پہنچا بیگمات کے منتظمین سے روپے کا مطالبہ کیا انکے انکار پر انواع انواع کی اذیتیں پہنچائیں جب اس طرح بھی کامیابی نہ ہوئی تو لوہے آگ میں سرخ کرکے ان کے جسموں پر لگوائے بیگمات کو معلوم ہوا تو فی الفور چھہتر لاکھ روپیہ ہسٹنگز کو دیدیا گیا۔

یہ عہدنامہ فیض آباد کی بھی خلاف ورزی تھی جسپر فریقین نے انجیل و قرآن کے درمیان دستخط کئے تھے۔

جیت سنگھ مہاراجہ بنارس آرام نگر، کمپنی سرکار کی کئی فرمائشیں پوری کر چکے تھے۔ ہسٹنگز ان سے پھر طالب امداد ہوئے۔ اس دفعہ انہوں نے معذرت کی، ہسٹنگز نے انہیں گرفتار کرنا چاہا۔ جیت سنگھ قلعہ کی پُشت کی ایک کھڑکی سے نکل کر گوالیار چلے گئے۔ ان کے جانشین سے اختیارِ حکومت و اختیارِ ضرب سکہ لے لیا گیا۔

لارڈ ولزلی گورنر جنرل آئے تو انہوں نے ہندوستان کے خود مختار والیانِ ملک کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی مکمل گرفت اور اُن پر انگلستان کی شہنشاہی مُسلط کرنے کا پروگرام تیار کیا۔ اور اُسے عملی جامہ پہنانے کے لئے امدادی فوج کی تجویز مرتب کی۔ پہلے نظام الملک کو اس کی پیش کش کی گئی۔ نظام نے مرہٹوں کے خوف سے بلا عذر اسے منظور کر لیا۔ ولزلی نے اپنے پیامبر نواب آصف الدولہ، ٹیپو سلطان اور پیشوا کے پاس بھیجے۔ آصف الدولہ نے پیش کش منظور نہیں کی۔ ٹیپو سلطان نے نمائندے کا سامنا تک نہیں کیا۔ پیشوا نے صاف انکار کر دیا البتہ یہ کہا کہ ٹیپو سلطان سے جنگ کی صورت میں ہم کمپنی کی مدد کر سکتے ہیں۔ ولزلی نے مرہٹوں کی قوت کا اندازہ کرتے ہوئے یہی غنیمت سمجھا۔ ولزلی خود لکھنؤ آیا۔ نواب کو سبز باغ دکھائے نشیب و فراز سمجھائے۔ آصف الدولہ نے معاہدہ فیض آباد کا حوالہ دیا۔ ولزلی نے نواب کو اطمینان دلایا کہ امدادی فوج آپ کی ملازم ہوگی اور آپ کے حکم کے تابع ہوگی اور آپ کی خود مختاری میں مطلق فرق نہ آسکے گا۔ بادلِ ناخواستہ نواب نے امدادی فوج کے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اس معاہدہ کی رُو سے سالانہ ایک خطیر رقم فوج کے مصارف کے لئے مقرر کی گئی

یہ معاہدہ اِس نام سے زبان زد ہوا "فوج کمپنی کی خرچہ نواب کا" اس فوج کے مصارف کی رقم میں ہر سال اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ یہ رقم ستتر لاکھ تک پہونچ گئی وسیع سلطنت کے گرانبار اخراجات کے سبب اتنی بڑی رقم کی وقت پر ادائی میں دشواری ہونے لگی۔ اسی کو حیلہ بنا کر اضلاع غازی پور۔ جون پور۔ بنارس نواب سے لے لئے گئے۔ اسکے بعد بھی نت نئے طریقے طلب زر کے جاری رہے جسکی وجہ سے وفادار وزیر خزانہ مہاراجہ جھاؤلال پریشان ہو جاتے تھے آخر مجبور ہو کر ایسے طلب و تقاضوں میں لیت و لعل کرنے لگے۔

کمپنی کی طرف سے انکو اس منصب سے ہٹانے کی کوشش کی گئی مگر نواب نے سماعت نہ کی بالآخر کسی بہانے سے مہاراجہ جھاؤلال کو انگریزی قلمرو میں بلایا گیا اور ہزاری باغ (بہار) میں نظر بند کر دیا گیا نواب کو معلوم ہوا تو بہت صدمہ ہوا۔

نواب انگریزوں کی وعدے خلافی۔ بدعہدی۔ احسان فراموشی اور آئے دن روپے کے تقاضوں سے شکستہ دل ہو گئے تھے۔ دو مہینہ علیل رہے علاج نہیں کیا۔ لوگ علاج پر اصرار کرتے تو کہتے۔ ٹوٹے ہوئے دل کا دنیا میں کوئی علاج نہیں۔ اسی حالت میں ۲۱ اکتوبر ۱۷۹۷ء میں رحلت کی اور اپنے امام باڑہ میں دفن ہوئے۔ بوقت انتقال خزانہ خالی تھا۔

نواب سعادت علی خان

از ۱۷۹۹ء تا ۱۸۱۴ء

خطاب نواب یمین الدولہ۔ نواب شجاع الدولہ کے فرزند اور نواب

آصف الدولہ کے علاّتی بھائی تھے۔

ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ہندوستان میں کوئی ایسا فرمانروا باقی نہیں رہا تھا جو بزور قوت اپنے ملک کو انگریزی سیاست سے محفوظ رکھ سکتا۔ صرف انہیں کی ذات تھی جنہیں ہندوستان میں انگریزی سیاست کے جال سے بے چینی رہتی تھی اور شب و روز نہ صرف اپنے بلکہ پورے ہندوستان کو انگریزی سیاست سے آزاد کرانے کی فکر دامنگیر رہتی تھی۔ اسکے لئے انہوں نے جو حکمت عملیاں جوڑ توڑ اور طریقے اختیار کئے وہ مخفی نہ رہ سکے اور انگریز انگوشتہ کی نظر سے دیکھنے لگے یہانتک کہ انکی جان لینے کے درپے ہو گئے۔ اسکے باوجود ایک انگریز مؤرخ نے انکے حسن انتظام کی ان الفاظ میں تعریف لکھی ہے۔ "HE WAS THE BEST RULER OUDH HAD EVER SEEN" ۔ بے نظیر انتظامی قابلیت کی وجہ سے ان کے والد نواب شجاع الدولہ نے انکو صوبہ روہیلکھنڈ کا گورنر مقرر کیا تھا جہاں یہ اپنے والد کی حیات تک اسی منصب پر فائز رہے۔ تخت نشین ہونے کے بعد عوام کی بہبودی اور خوشحالی کا خیال جتنا انکو تھا شاذ و نادر ہی کسی فرمانروا کو ہوا ہوگا۔ راتوں کو بھیس بدل کر بازاروں اور گلی کوچوں میں پھرتے اور بچشم خود عوام کے حالات اور انکی مشکلات معلوم کرنے کی کوشش کرتے اور حتی الامکان ان کا ازالہ کرتے۔ دور دراز شہروں کے حالات سے باخبر رہنے کے لئے اخباری نمائندے مقرر تھے جو روز اپنے اضلاع کے حالات سے نواب کو باخبر رکھتے۔

نواب علی روزانہ خود اجلاس کرتے تھے جہاں کسی قسم کی روک ٹوک

نہیں تھی ہر خاص و عام اپنا مرافعہ حضور میں پیش کر سکتا تھا ان پر بلا دقت احکام جاری ہوتے تھے۔ ان کے عہد میں کسی کو کسی پر ادنیٰ سا ظلم یا زیادتی کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی ہر طرف امن و امان کا دور دورہ تھا ہر طبقہ کے لوگ خوش و مطمئن تھے۔

نواب عالی اپنی ذات پہ زیادہ صرف نہیں کرتے تھے اور سادہ طرز زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔

مہتمم اصطبل نے گھوڑوں کے لئے جھیلہ بنانے کے استدعا کی درخواست دی۔ جسپر نواب نے یہ حکم لکھا۔ آخور طویلہ برائے تجنیت جھیلہ المخصوص نے کوئی وزیر نہیں رکھا۔ وزارت کے کام خود انجام دیتے تھے۔ مولوی مدن ان کے نائب تھے جو ایک نہایت قابل اور تجربہ کار شخص تھے۔

ان کے عہد میں فرحت بخش۔ حیات بخش۔ موتی محل۔ خورشید منزل۔ نور بخش۔ دل کشا۔ دل آرام۔ لال بارہدری۔ بیگم کوٹھی۔ ٹیڑھی کوٹھی۔ کنکر والی کوٹھی۔ بیلی گارد (ریزیڈنسی) درگاہ حضرت عباس اور کربلائے تال کٹورہ کی تعمیر ہوئی۔

دربار

قبل طلوع آفتاب کے دربار سواری کا فرماتے تھے۔ عرب اور جنگل کے تالی میل سے سات ہزار خانہ زاد گھوڑے تھے۔ محل سے بوچہ (ایک سواری) پر سوار ہو کر برآمد ہوئے گھوڑے پہ سوار ہوتے۔ اسوقت آپ لباس انگریزی۔ ولایتی ڈلب زیر کمر کئے ہوئے اور سیاہ مغلئی ٹوپی دیئے ہوتے تھے۔ پہلے سلام مرغفنادوں کا ہوتا تھا اسکے بعد امرائے خاص کا۔

لہ تاریخ میں یہی نام لکھا ہے۔ ۱۲

دنگھڑی میں ہواخوری سے فراغت کرکے ہاتھی پر مع جلوس سوار ہوتے تھے سواری مع جلوس مع ڈنکا و نشان ہوتی تھی امرائے دولت پالکیوں پر سوار ہمراہ ہوتے تھے۔ خاص بردار حنبور لئے ہوئے چوبدار سواری کے داہنے بائیں سوار ہوتے تھے۔ مرزا کریم بیگ محمد غلامی سوار انگریزی پوشاک میں آگے آگے رہتے تھے۔ بیس سوار اور بیس پیدل روزانہ اہتمام سواری کرتے تھے اور کل اہتمام نواب انتظام الدولہ مظفر علی خان کے سپرد تھا نواب اشرف الدولہ مفضل علی خان مرزا اشرف علی بھی ہمراہ رہتے تھے۔ روزانہ پہرہ چوکی پر بائیس آدمی مختلف فرقے کے ملازم تھے ان میں دو سوار بھی تھے۔ دربار سواری کی یہی شان تھی۔ امراء در دولت سے رخصت ہو جاتے تھے۔ نو بجے صبح کو جا لیے پائی ہوتا تھا۔ کرسی نشین امراء مقربان خاص صمصام الدولہ مرزا محمد مرزا محمد تقی خان ہوس پہلو میں۔ ہکلوڈ صاحب ڈاکٹر لا صاحب خالص کرسی کی پشت پر بیٹھتے تھے۔ میر انشاء اللہ خان انشاء ابوالقاسم خان سراج الدولہ معززین خواجہ سرا باریاب سلام ہوتے تھے۔

سلام کا قاعدہ یہ تھا کہ مردہا (نقیب) پہلے عرض خدمت کرتا تھا پھر عرض بیگی لیے سامنے پیش کرکے ادب قاعدے سے سلام کراتا تھا اس میں بہت دیر موقع محل دیکھنے میں ہو جاتی تھی۔ ایک دربار وقت خاصے کے ہوتا تھا جس میں مقربان خاص اردلی و نواب جلال الدولہ مہدی علی خان سدکن الدولہ۔ نواب محمد حسن خان شریک خاصہ ہوتے تھے اسکے بعد حضور محل میں تشریف لے جاتے تھے۔ بارہ بجے برآمد ہوتے اجلاس فرماتے تھے کاغذات ملاحظہ فرماتے تھے۔ نواب نصیر الدولہ تمام رپورٹیں ایک بند لفافہ میں پیش کرتے تھے۔ نواب محسن الدولہ بھی کاغذات بند لفافہ میں پیش کیا کرتے تھے

اور آپ علٰحدہ کمرے میں حاضر رہتے۔ اسی طرح نواب منتظم الدولہ مہدی علی خان راجہ دیا کرشن رائے رتن چند محاسب۔ رائے رام اخبار نویس خفیہ منشی رونق علی منشی لائق علی اپنے اپنے کاغذات میز پر رکھکر علٰحدہ کمرے میں بیٹھتے تھے استفسار کے لئے بلائے جاتے تھے۔ جناب عالی ملاحظہ فرماکر ضروری کاغذات پر دستخط فرماتے تھے اور جو قابل داخل دفتر ہوتے تھے وہ طشت آب میں ڈالدیئے جاتے تھے ان کا ایک ایک حرف دھو ڈالا جاتا تھا۔ جس کاغذ پر مُہر خاص کرنا ہوتی تھی ظفر الدولہ سامنے حضور کے مُہر کرتے تھے۔ جو کاغذ باقی رہجاتے تھے رات کو ملاحظہ فرماتے تھے۔ بوجہ اخبار ہر وقت گزر سکتا تھا۔ بعد دستخط تمام کاغذات ہر دفتر میں بھجوادیئے جاتے تھے اور اُسی روز حکم احکام جاری ہوجاتے تھے۔ وقت شام دو اسپہ گاڑی پر سوار ہوکر ہواخوری کو نکلتے تھے۔ جلوس سواری میں راجہ بختاور سنگھ کا رسالہ ترک سواران ہمراہ ہوتا تھا۔ کبھی نام دان (ایک سواری) پر تشریف فرما ہوتے تھے۔ اکثر سعادت گنج میں جاکر نرخ غلّہ کا دریافت فرماتے تھے کہ عوام کو گرانی سے تکلیف نہ ہو۔ بقّال اسی خوف سے اناج مہنگا نہیں کرسکتے تھے اُسوقت آٹا دو پیسہ سیر بکتا تھا۔

نواب آصف الدولہ کی ایک دختر تھیں اس لئے انہوں نے وزیر علی خان کو متبنّیٰ کیا تھا اور جانشین بنایا تھا۔ انکے بعد یہی تخت نشین ہوئے۔ آصف الدولہ کے جائز جانشین نواب سعادت علی خان تھے جو باغ مادھو داس بنارس میں سکونت رکھتے تھے۔

انہوں نے متعدد بار اپنی حقیّت سے گورنر جنرل لارڈ ولزلی کو آگاہ کیا

لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ آخر براہِ دریائے گنگا خود عازم کلکتہ ہوئے بمقام راج محل (بہار) گورنر جنرل سے ملاقات ہوئی جو بنارس ہوتے ہوئے لکھنؤ جا رہے تھے۔ نواب نے جواب نہ ملنے کی شکایت کی۔ ولزلی نے کہا۔ اب تو میں خود آ گیا ہوں سب اُمور بنارس میں طے ہو جائینگے دو دن بنارس میں قیام کرکے لکھنؤ جاتے وقت ان سے کہا کہ مسٹر چیری کمشنر بنارس آپ سے ملیں گے انکو تمام اُمور سمجھا دیئے گئے ہیں وہی سب معاملات طے کرینگے چیری صاحب نواب سے ملے اور ولزلی کی طرف سے پیام دیا کہ اگر آپ نصف سلطنت کمپنی سرکار کو تفویض کرنا منظور کریں تو بسر و چشم لکھنؤ تشریف لائیں اور تخت نشین ہوں ورنہ آپ کے چھوٹے بھائیوں میں جو بھی یہ شرط منظور کریگا اُسے تخت نشین کر دیا جائے گا۔ نواب کو حیرت ہوئی اور جواب کے لئے کچھ مہلت طلب کی۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن بالآخر حوالگی نصف سلطنت پر رضامند ہوئے۔ چیری صاحب نے عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا۔ لکھنؤ پہونچے تو شاہانہ استقبال ہوا بڑی شان و شوکت سے جلوس نکالا گیا۔ قصر دل کشا میں فروکش ہوئے بوقت تخت نشینی نیا عہد نامہ پیش کیا گیا۔ نواب نے دستخط کر دیئے دو آبہ اور مشرقی اضلاع جنکی سرحد صوبہ بہار سے ملتی تھی کمپنی کو تفویض کر دیئے لیکن پانچ سال تک قبضہ نہیں دیا۔ ولزلی پھر لکھنؤ آیا اور ریزیڈنسی میں ٹھہرا اور نواب کے نائب مولوی مدن کو بلوایا جب مولوی صاحب پہنچے تو ولزلی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا سامنے میز پر ایک طرف عہد نامہ اور دوسری طرف تلوار رکھی تھی۔ ولزلی نے سلام و مصافحہ کے بعد پہلے عہد نامہ کی طرف اشارہ کیا اسکے بعد تلوار کی طرف۔ مولوی مدن نے تلوار کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے کہا کہ اس کا فیصلہ تو جنگ بکسر اور جنگ کڑہ مانک پور میں ہو چکا اب رہا عہد نامہ تو اس پر چند روز میں عمل ہو کر آمد بند ہو جائے گا خاطر جمع رکھئے مولوی صاحب موصوف نے واپس آکر سب کیفیت نواب سے بیان کی اور مشورہ دیا کہ اب قبضہ دینے میں لیت و لعل مناسب نہیں ہے۔ نواب نے اسی وقت مفوضہ اضلاع کی حوالگی کے احکام جاری کر دیئے۔ احکام پہنچتے ہی تمام اضلاع کی آمدنی وغیرہ کے بہی کھاتے (رجسٹر) وغیرہ تلف کر دیئے گئے اور نصف سلطنت قلمرو کے انگلشیہ میں شامل ہو گئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو آئے دن مالی مشکلات کا سامنا رہتا تھا۔ نواب نے گورنر جنرل کو پیش کش کی کہ کل ممالک محروسہ پٹہ کا ٹھیکہ ان کو دیدیا جائے اور ایک سال کی پیشگی آمدنی لیلی جائے۔ گورنر جنرل نے شکریے کے ساتھ نفی میں جواب دیا مگر پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نواب سے ہوشیار رہنے لگا۔

ایک نامزد گورنر جنرل جو عنقریب عازم ہندوستان تھے اور انکی ہمدردی جائداد اجلت قرضہ نیلام پر چڑھی ہوئی تھی اور جسے نیلام سے بچانے کی کوئی سبیل ممکن نہ تھی۔ نواب کو معلوم ہوا تو انہوں نے انکو ایک کروڑ روپیہ انگلستان بھجوا دیا۔ روپیہ نامزد گورنر جنرل کو پہنچ گیا تو انہوں نے نواب کو ممنونیت اور شکر گزاری سے لبریز خط لکھا اور لکھا کہ میں اور میری آئندہ آنے والی نسلیں بھی آپ کے اس احسان عظیم کو کبھی نہیں بھولیں گی۔ اس کے جواب میں نواب نے وہ سب زیادتیاں اور بدعہدیاں جو کمپنی سرکار کی طرف سے ان پر کی گئی تھیں لکھ بھیجیں جس کے جواب میں نامزد گورنر جنرل نے لکھا کہ میں عنقریب ہندوستان پہنچنے والا ہوں اور پہنچتے ہی ان سب شکایتوں کا ازالہ کر دوں گا جو آپ نے لکھی ہیں۔ باوجود احتیاط کے یہ خط و کتابت مخفی نہ رہ سکی۔ انہیں اسباب سے

جان لینے کی تدبیریں ہونے لگیں جن میں نواب کے خاص معتمد رمضان علی بھی شریک تھے۔
سید کمال الدین حیدر صاحب نے لکھا ہے کہ نواب شب کو آرام کرنے سے پہلے یخنی نوش فرماتے تھے۔ باورچی کو ایک بوتل دی گئی جس میں ایک سیاہ گرگٹ بند تھا اور اسے ہدایت کی گئی کہ بوتل یخنی میں ڈال کر ڈاٹ کھول دے چنانچہ اس نے یہی کیا اور وہی یخنی نواب کو پیش کی گئی۔ نواب نے دو ہی چار گھونٹ پی کر یخنی کی بدمزگی ظاہر کی اور یخنی کا پیالہ واپس کر دیا۔ مسہری پر بیٹھے ہی تھے کہ خون کا ایک استفراغ ہوا ایک بڑا اگالدان بھر گیا محل میں کہرام مچ گیا۔ ولی عہد نواب غازی الدین حیدر اور ارکان خاندانِ شاہی پابرہنہ دوڑے آئے۔ ایک آنِ واحد میں خوابگاہِ شاہ انبوہِ خاص و عام سے بھر گئی۔ اسی اثنا میں دوسرا استفراغ ہوا جس میں خون کے ساتھ جگر وغیرہ کے ٹکڑے تھے اس سے ایک طشت لبریز ہو گیا شاہ ذیجاہ نڈھال ہو گئے۔ چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ ایک ہچکی آئی اور ۱۷ر جولائی ۱۸۱۴ء کی شب کو فرحت بخش میں روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ انتقال کی خبر شہر بھر میں پھیل گئی۔ دفعتاً موت کی خبر سے لوگوں میں اضطراب پیدا ہوا اور جوق در جوق فرحت بخش کی طرف آنے لگے۔ اکثر اہلِ لکھنؤ رات بھر نہیں سوئے اور بعض گھروں سے تمام رات رونے کی آوازیں آتی رہیں۔ صبح تک فرحت بخش کے چاروں طرف انبوہ کثیر جمع ہو گیا۔

دن چڑھے کنارِ دریا غسل دیا گیا۔ تمام رات اور دن میت کے منہ سے خون جاری رہا۔ سہ پہر کو جنازہ اُٹھا۔ جنازے کے ساتھ کثیر مجمع تھا۔ ادنیٰ و اعلیٰ ہندو مسلمان سب شریک تھے قبل غروبِ آفتاب تدفین ہوئی۔

یہ اودھ کے پہلے فرمانروا تھے جنہوں نے محفوظ خزانے میں چودہ کروڑ روپیہ چھوڑا جو ابتک اودھ میں چھبیس کروڑ کی چوتھائی کے نام سے زبان زد ہے۔ اسکے علاوہ منوں کی تعداد میں سونا بھی تھا۔ زر و جواہر کے بیش بہا آبائی خزانے زیر زمین تھے جنکی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں اور جو باوجود تلاشِ بسیار انگریزوں کو نہ مل سکے۔

غازی الدین حیدر بادشاہ

از ۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء

خلف نواب سعادت علی خاں ایک روشن خیال اور اچھے فرمانروا تھے۔ ان کا خطاب ہز مجسٹی نسلاً بعد نسل ایسٹ انڈیا کمپنی نے تسلیم کیا۔ اسوقت سے فرمانروایانِ اودھ بادشاہ کہلانے لگے۔ ہندوستان میں یہ خطاب کسی اور والئی ملک کا نہیں تھا۔ انہوں نے ایک کروڑ کا تختِ شاہی بنوایا۔ جنگِ نیپال کے لئے ایک کروڑ روپیہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو قرض دیا جو بعد وقفِ شاہ نجف میں تبدیل ہوگیا دریائے گنگا سے نہر نکلوائی۔ اس میں بھی ایک کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ لیکن انجینئروں کی غلطی سے نہر دریا سے تین فٹ اونچی ہو گئی اس لئے پانی جاری نہ ہو سکا۔ یہ خشک نہر اب بھی موجود ہے۔ اور غازی الدین حیدر کی نہر کے نام سے مشہور ہے۔

انکے عہد میں نیپال کی ترائی کا علاقہ قلمرو ئے اودھ میں شامل ہوا۔ شاہ غازی الدین حیدر نے ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو بعارضہ بخار

انتقال کیا اور شاہ نجف میں دفن ہوئے۔

اس عہد میں محل مبارک منزل۔ ولایتی باغ اور شاہ نجف کی تعمیر ہوئی۔

دربار

ایک بسنتی دربار بسنت کے موسم میں خاص اہتمام سے کرتے تھے ان کے بعد لکھنؤ میں ایسا بسنت کبھی نہیں ہوا۔ یہ دربار موتی محل میں اور شاہ منزل خاص میں ہوتا تھا جس میں ہر فرقہ کے لوگ جمع ہوتے تھے۔

آپ کے دربار کا طریقہ یہ تھا کہ صبح نو بجے درِ دولت سے کوٹھی فرح بخش میں جلوس فرماتے تھے۔ کنارۂ نہر بینڈ باجہ سے سلامی ہوتی تھی۔ جب تختِ شاہی پر متمکن ہوتے دو چنور بردار مورچھل ہلاتے تھے۔ پہلے صاحبزادے سلام کو آتے تھے پھر بھائی نواب نصیر الدولہ کاظم علی خان۔ جعفر علی خان۔ حسین علی خان۔ مہدی علی خان۔ نواب علی خان نہایت ادب سے اپنی اپنی کرسی کے پاس کھڑے رہتے تھے۔ جب بادشاہ بہ اشارہ ابرو سلام قبول کرتے تو اپنی اپنی جگہہ بیٹھ جاتے۔ بائیں طرف میکلوڈ صاحب بیٹھتے جن سے فارسی میں گفتگو ہوتی۔ کمرے کے ایک گوشہ میں ایک انگریز مشبک (بیگ پائپ) بجاتا تھا جو بہت سریلی ہوتی تھی۔ رجب علی فضل علی خیال گاتے تھے۔ شرفو بائی دکن کی رہنے والی نے غضب کی آواز پائی تھی۔ جب صبح کے وقت گاتی تھی ؎

اے نسیم سحر آرام گہہ یار کجاست۔ سبکو وجد ہوجاتا تھا اور جھومنے لگتے تھے خصوصاً میکلوڈ صاحب کی کیفیت کچھ نہ پوچھئے۔

جناب عالی کے سامنے ایک قدِ آدم آئینہ وسط میز پر رکھا جاتا تھا۔ آئینہ کے سامنے ایک بلوریں جھاڑ تھا جس کے ہر پیالہ میں دھنیا۔ الائچی۔ مسالہ وغیرہ خوشنمائی سے چُنا جاتا تھا۔ میز پر ہندوستانی اور انگریزی عمدہ عمدہ کھانے چُنے جاتے تھے اور گلدستے لگائے جاتے تھے۔ اہل دربار وہاں بیٹھ کر کھاتے پیتے اور آپس میں باتیں کرتے تھے۔ تمام مجرائی الال پردے کے باہر بیٹھے رہتے تھے۔ جب حکم ہوتا تھا سلام کو حاضر ہوتے تھے۔ نجم الدولہ رائے امرت لال شیخ فتح علی سلام کو آتے تھے اسکے بعد یہ دربار برخاست ہوتا تھا اور جناب محلسرا میں تشریف لیجاتے۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ

از ۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء

اس کارگاہِ عالم میں قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں روزمرہ کی باتیں ہیں۔ قومیں اُبھریں اور فنا کی نیند سو گئیں۔ سلطنتیں بنیں اور بگڑ گئیں لیکن اسلامی سلطنتوں کی تباہی اتنی المناک ہے کہ سُننے والوں کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے اسی طرح ایک اسلامی سلطنت اودھ اُبھری چمکی اور ماضی کی تاریکیوں میں گم ہو گئی اور اُس پر کوئی آنسو بہانے والا بھی نہ رہا۔ اسکے دو ایک حکمرانوں نے وہ طریقے اختیار کئے کہ ان کے اپنے ان سے متنفر ہو گئے۔ مؤرخین نے ان کا تذکرہ اس انداز میں کیا کہ سُننے والے کانوں پہ ہاتھ دھر لیں لیکن اس حقیقت

سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اودھ کے مسلمان حکمرانوں نے سوا سو سال سے زیادہ قلیل مدت میں وہ کارہائے نمایاں انجام دئیے کہ رہتی دنیا تک ان کا نام رہے گا۔ اس سلطنت کے عروج دور میں علم وفن کو جو ترقی اور کمال حاصل ہوا اسکی مثال دیر پا قائم رہنے والی سلطنتیں پیش نہ کر سکیں۔ لکھنؤ اور اودھ میں اسلامی سلطنت ایک خیال تھا کہ دماغ میں آیا اور نکل گیا۔ ایک خواب تھا کہ پوری طرح دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ آنکھ کھل گئی یا ایک طلسم تھا جو چشم زدن میں بنا اور مٹ گیا کہ دیکھنے والے کچھ بھی نہ دیکھ سکے اور جنہوں نے سمجھ بھی لیا پوری طرح بیان نہ کر سکے اور اگر بیان بھی کیا تو داستان تشنہ رہ گئی۔

شاہ نصیر الدین حیدر خلف شاہ غازی الدین حیدر کا عہد دولت وثروت کے اعتبار سے زریں عہد تھا جسکی مثال تاریخ اودھ میں نہیں ملتی ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک سب مرفہ الحال تھے۔ انکی سخاوت اور دریا دلی کی تمام ہندوستان میں شہرت تھی اور اسی سبب سے لکھنؤ ہندوستان بھر کے اہل کمال اور متلاشیان روزگار کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اسوقت اکثر اہل یورپ اور شاہزادگان دہلی لکھنؤ میں سکونت رکھتے تھے اور بادشاہ کی فیاضی سے فائز المرام ہوتے تھے۔ اسی عہد میں لکھنؤ میں بے شمار محلات اور عالی شان عمارتیں تیار ہوئیں جو زیادہ تر ان لوگوں نے تعمیر کی تھیں جنکی تنخواہیں نہایت قلیل تھیں شاہ نصیر الدین حیدر کی فیاضی نے انکے عہد تک اودھ میں غریبی کے لفظ کو بے معنی بنا دیا تھا اور انکے دریائے جود وسخا سے سب ادنیٰ و اعلیٰ سیراب ہوتے تھے۔ محاصل سلطنت کے علاوہ

چودہ کروڑ روپیہ نواب سعادت علی خاں کا ترکہ خزانہ میں محفوظ تھا اسکے سوا ملک قحط سے پاک تھا۔ بادشاہ کی فیاضی میں نواب قدسیہ محل کا بڑا ہاتھ تھا اور وہ داد و دہش میں بادشاہ سے بڑھی ہوئی تھیں۔

شاہ نصیر الدین حیدر کے والد انکی افتاد طبیعت سے خوش نہیں رہتے تھے لیکن یہ ایسے بھی نہیں تھے جیسا ان کا انجام ہوا۔ بوقت تخت نشینی کم سن اور ناتجربہ کار تھے اور فرنگی کا سفر نا ئیاں الدیش پیش نہیں۔ ابتدا ہی میں چند فرنگی خاص مصاحبت میں رکھے گئے انہوں نے جلدی ہی جہاں پناہ کو مغربی طرز معاشرت کی طرف رجوع کیا۔

بادشاہ شاہ انگلستان کی وضع کا لباس زیب تن کرتے تھے۔ میز کرسی پر اپنے خاصہ کے ساتھ انگریزی کھانے تناول کرنے لگے جو شاہی مطبخ میں ایک فرانسیسی مہتمم کے زیر اہتمام تیار ہوتے تھے۔ مغربی رقص و سرود کا سامان مہیا ہوا۔ اور ایک انگریز خاصہ تماشہ (حجام) بھی آ گیا جسے جہاں پناہ نے سرفراز خاں کا خطاب عطا کیا۔ مے نوشی کا شغل شروع ہی سے جاری کرا دیا گیا تھا اور دن بہ دن اس میں اضافہ ہوتا جاتا تھا عالم بے اختیاری میں ان سے ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں کہ اعزا اور عوام میں انکی بدنامی اور رسوائی ہوئی اور یہی انگریزی سیاست کا مقصد تھا۔

بادشاہ کے کئی محل تھے (بیویاں)۔ ان میں ملکہ زمانیہ اور نواب قدسیہ محل باوفا اور ہمدرد تھیں۔ نواب قدسیہ محل اور بادشاہ میں نا اتفاقی ہو گئی جسکی تاب نہ لا کر انہوں نے زہر سے خودکشی کر لی۔ بادشاہ کو بھی ملکہ سے دلی لگاؤ تھا لیکن وہ یہ نہ جانتے تھے کہ وہ خودکشی کر لینگی

اس کا ان کو اتنا صدمہ ہوا کہ خود سیاہ پوش ہو گئے اور تمام ملک محروسہ میں چالیس یوم تک ہر خاص و عام کو سیاہ پوش ہونے کا حکم جاری کیا۔ جنازے کے ساتھ خود بدولت انگریزی رزیڈنٹ اور سب شرکاء سیاہ پوش تھے۔ تدفین کربلائے نو نصیر الدین حیدر ارادت نگر میں ہوئی نواب قدسیہ محل نے پنجشنبہ ۵ ربیع الثانی سنہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۲۱ اگست سنہ ۱۸۳۴ء انتقال کیا۔

بادشاہ انکے مرنے سے بہت دل شکستہ ہو گئے تھے۔ قبر پر جا کر گھنٹوں رویا کرتے تھے۔ تفریح اور دل بہلنے کے سب سامان اٹھا دیئے گئے۔ مگر غم غلط کرنے کے لئے فرنگی مصاحبوں نے مے نوشی میں اور اضافہ کرا دیا۔ اس پر بھی طبیعت اتنی بے کیف رہتی تھی کہ انہوں نے قدسیہ محل کے مرنے کے بعد محلات میں سے کسی کا سامنا نہیں کیا۔

بادشاہ کی سوتیلی والدہ جناب عالیہ[1] (بادشاہ بیگم محل خاص شاہ غازی الدین حیدر) تعزیت کو آئیں جو بہو کے سوگ میں سیاہ پوش نہیں تھیں۔ نصیر الدین حیدر نے شکایت کی۔ انہوں نے کہا کہ وہ سوگ حضرت سید الشہداء اور جناب امیرؑ کا کر لی ہیں اور کسی کا نہیں کر سکتیں یہ کہا اور اٹھ کر چلی گئیں۔ جہاں پناہ نے انکے پاس پیام بھیجا کہ وہ اپنا محل خالی کر کے شہر کے باہر الماس باغ میں سکونت اختیار کریں۔ جناب عالیہ نے جواب دیا کہ محل انکے شوہر کا عطیہ ہے۔ اس پر محل کھودنے کا حکم دیا گیا۔ محل کھودنے والے آ رہے تھے کہ جناب عالیہ کی

---

[1] متوفی شاہ اودھ کی ملکہ اولی جناب عالیہ کہلاتی تھیں اور بادشاہ وقت کے برابر ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ ۱۲

زنانہ محافظ اسلحہ بردار ترکنوں اور حبشنوں نے ان پر گولیوں کی بوچھار کردی۔ دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں بیسیوں جانیں ضائع ہوئیں اتنے میں رزیڈنٹ آگئے اور جناب عالیہ کو الماس باغ میں سکونت اختیار کرنے پر رضامند کر لیا۔

نواب روشن الدولہ وزیر اعظم کے اشارے پر بادشاہ کی انّا جی کے بیٹے آغا مرزا اور انّا کے داماد نیز بانکوں نے شہر میں اودھم مچا رکھا تھا کسی کی جان ومال عزت وآبرو محفوظ نہیں تھی۔ عجب کیا کہ اس میں بھی فرنگی سیاست کارفرما ہو۔ انتزاع سلطنت تو اسی زمانہ میں ہو جانا چاہئے تھا لیکن انگریزوں نے اس وقت کسی مصلحت سے ایسا نہیں کیا۔

بادشاہ کا برتاؤ اپنے قریبی عزیزوں سے اچھا نہ تھا۔ قدسیہ محل کے مرنے سے داد و دہش انعام واکرام کی بارش کا سلسلہ موقوف ہو گیا تھا اور محلسرا کا زنانہ عملہ جو سیکڑوں پر مشتمل تھا ایک بہت بڑے فیض سے محروم ہو گیا تھا اس لئے بااثر عملہ میں بادشاہ کا غم غلط کرانے کے لئے انکی ایک اور شادی ہونے کی سازشیں ہونے لگیں جن میں افضل النساء خانم دھنیا مہری پیش پیش تھی۔ محل میں اسکی طوطی بول رہی تھی اور بادشاہ سے بے تکلفی سے باتیں کرتی تھی۔ نواب روشن الدولہ قدسیہ محل کی سفارش پر وزیر اعظم ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے اقتدار کی مضبوطی اور دولت سمیٹنے کے لئے اپنی بھانجی سے جہاں پناہ کا عقد کر دیا۔[1] عقد کے دوسرے ہفتہ بادشاہ نے کئی لاکھ روپیہ نقد قیمتی پارچات اور دوشالے نئی ملکہ کو اس لئے بھیجے کہ وہ اپنے عزیزوں میں تقسیم کر دیں

[1] یہ شادی بھانجی کی رضامندی سے نہیں ہوئی تھی۔ ۱۲

لیکن انکی والدہ نے وہ سب خود ہی رکھ لئے۔ جہاں پناہ کو ناگوار ہوا اور اُس دن سے انہوں نے عروسِ نو کی صورت نہیں دیکھی۔ روشن الدولہ دشمن ہو گئے اور جان لینے کی تدبیریں کرنے لگے۔ ملکہ زمانیہ[1] نے اس فتنہ پر بادشاہ کو خبردار کیا تھا لیکن ان کا دماغ اتنا ماؤف ہو گیا تھا کہ کسی بات کے سمجھنے کی صلاحیت نہ رہی تھی۔

انگریز خاصہ تراش خان کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ بادشاہ کا مزاج دان تھا اور وہ اس سے بہت خوش تھے۔ شاہی آب دار خانہ (آبِ خاصہ) اور مئے نوشی کا سامان انہیں کے زیرِ انتظام تھا۔ روشن الدولہ نے سبحان علی خان کمبوہ کی معرفت شاہی محل کی خواص دِل جیت کو بادشاہ کو زہر دینے پہ آمادہ کیا۔ ایک دن یہ کسی بہانے سے خان کے پاس گئی وہ اُس وقت چند انگریز عورتوں سے باتیں کر رہا تھا اسے دوسرے کمرے میں بٹھا دیا جہاں چار الماریوں میں شراب کی بوتلیں چُنی ہوئی تھیں بعض میں مُہر نہیں لگی تھی۔ دل جیت نے زہر کی چھوٹی شیشی کھول کر شراب کی ایک بوتل میں ڈال دی خان کسی کام سے رزیڈنسی گیا اور یہ بھی چلی گئی واپس آکر خان نے بغیر مُہر کی بوتلوں پہ مُہر لگا لی اور اُسی دن اتفاق سے زہر آلود بوتل کی شراب جام بھر کے جہاں پناہ کو پیش کی وہ ایک دریچے سے دریا کی طرف دیکھنے لگے ایک بلی نے جام میں منہہ ڈال دیا۔ چکھتے ہی تیورا کر گری اور مر گئی۔ خان خوف زدہ ہو کر رزیڈنسی چلا گیا۔ بادشاہ کو اس پہ شک تھا روشن الدولہ کی معرفت بُلوایا۔ اُس نے جنرل لو کے سامنے ابنِ مریم کی قسم کھائی اور

[1] ملکہ زمانیہ ایک فہمیدہ خاتون تھیں بادشاہ انکے مشورے کو وقعت دیتے تھے اور وہی ایک انکی ہمدرد اور بہی خواہ تھیں۔ ۱۲

زہر کی آمیزش سے لاعلمی ظاہر کی۔ رزیڈنٹ خود اسے لیکر جہاں پناہ کے پاس آئے اور یقین دلایا کہ اس کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔ جہاں پناہ مطمئن ہو گئے اور ایک نوڑا منگا کر اُسے انعام دیا۔

خان کو انگریزوں نے مشورہ دیا کہ بلا تاخیر کلکتہ چلا جائے اس لئے کہ بادشاہ کی جان لینے کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔ وہ بے گناہ کیوں نا خوش ہو۔ خان نے اسی ہفتہ اپنا ستائیس لاکھ روپیہ کلکتہ منتقل کیا دو چار روز بعد خود بھی چلا گیا۔

روشن الدولہ نے کئی بار بادشاہ کو زہر دلوایا لیکن ہر دفعہ بادشاہ کو علم ہو گیا۔ دل حبیب خواص اور انکی داشتہ دھنیا مہری کی بہن ڈلوی کی کوشش ناکام ہو گئی۔ روشن الدولہ اور یہ دونوں صاف بچ گئے شبہ میں بیسیوں ناکردہ گناہ سزایاب ہوئے اور چند کو پھانسیاں ہوئیں۔ بادشاہ بہت سہمے ہوئے رہتے تھے اور اپنے متفرشین سے کہتے تھے کہ مجھے بہت جلد زہر دیکر میری زندگی کا خاتمہ کر دیا جائیگا۔ حفظ جان کے خیال سے چار چار دن کھانا نہیں کھاتے تھے۔ جب بھوک لگتی تھی تو مزدوروں سے خرید روٹی اور لنگروں سے بھنی ہوئی جوار اور چنے لیکر جیب میں بھر لیتے تھے یا فصلی میووں پر قناعت کرتے تھے۔ عموماً ولائتی پانی کی سربمہر بوتلیں اپنے سامنے کھلوا کر پیتے تھے یا پھر ایک کنوئیں سے اپنے سامنے پانی بھروا کر پیتے تھے اور اُسے مقفل کر دیتے تھے۔

اسی اثنا میں ہاتھ پیروں پر ورم آ گیا۔ ہر وقت داستانے اوڑھے پہنے رہتے تھے۔ انا جی۔ دھنیا مہری۔ اسکی بہن ڈلوی اور دل حبیب حضوری میں رہتی تھیں۔ انکے سامنے جو پکا کر دسترخوان پر رکھ دیا جاتا تھا کھا لیتے

تھے۔ حکیموں کی ڈاک بیٹھی ہوئی تھی۔

۱۹ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ تک اُٹھ کر بیٹھ جاتے تھے اور کچھ چل لیتے تھے۔ اُسی دن شب کو انا جی کے یہاں سے کھانا آیا اُس میں کریلوں کا قلیہ بھی تھا۔ بادشاہ نے وہی کھایا۔ رات گئے طبیعت بگڑی لیکن زندہ رہے اُسی دن جنرل گورنر ریذیڈنٹ روشن الدولہ کے پاس آئے۔ روشن الدولہ نے بادشاہ کی شکایت کی۔ ریذیڈنٹ نے جواب دیا۔ ان میں اب حکومت کرنے کی صلاحیت نہیں رہ گئی ہے لیکن گورنر جنرل انکو معزول کرنا نہیں چاہتے اور نہ انکو تخت پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ روشن الدولہ نے کہا۔ آپ حکم دیں تو راستہ صاف ہو جائے۔ اسکے بعد ریذیڈنٹ۔ نائب ریذیڈنٹ کیپٹن برڈ (BIRD) ایک انگریز ڈاکٹر کے ساتھ بادشاہ کو دیکھنے گئے خوابگاہ خاص کے باہر دس گورے اور پانچ ہندوستانی مسلح سپاہی تعینات کر دیئے گئے۔ انا جی۔ دھنیا مہری۔ روشن الدولہ اندر تھے۔ ملکہ زمانیہ نے اندر جانا چاہا انکو روک دیا گیا۔ دھنیا مہری نے روشن الدولہ کے اشارے پر بادشاہ کو آب تربوز پلایا۔ اس میں زہر تھا جسکے اثر سے بادشاہ انتقال کر گئے۔ ڈاکٹر نے رگ میں نشتر دے کر موت کی تصدیق کی۔ انا جی نے روشن الدولہ سے کہا کہ تم نے آب تربوز میں زہر دلوا دیا۔ اور روتی پیٹتی بین کرتی ہوئی باہر نکلیں۔ محل میں کہرام مچ گیا۔

شہر بھر میں رات ہی کو مشہور ہو گیا کہ روشن الدولہ نے دھنیا مہری کے ہاتھ سے بادشاہ کو زہر دلوایا۔

تاریخ انتقال ۷ جولائی ۱۸۳۷ء ہے۔ تدفین کربلا نصیر الدین حیدر امداد نگر میں ہوئی۔

چھتر منزل۔ کربلا نصیر الدین حیدر۔ دار الشفا چوک۔ انگریزی شفاخانہ وکٹوریہ گنج انکے عہد میں تعمیر ہوئے۔ اور جھولے والا پل۔

روشن الدولہ کو محمد علی شاہ نے ۲۷ جمادی الآخر ۱۲۵۳ھ کو وزارت عظمیٰ سے برطرف کیا اور منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خان کو فرخ آباد سے طلب کر کے یہ عہدہ ان کو تفویض کیا۔ روشن الدولہ کو قید کیا گیا۔ کل جائداد ضبط ہوئی نقدی داخل خزانہ ہوئی۔ عمال حکومت کی لاکھوں روپے سے منہ بھرائی کی جب کہیں جان بچی۔ کانپور میں دوسروں کے رحم و کرم پر پڑے دانہ دانہ کو محتاج ہوئے اور خیرات پر زندگی گزارنے لگے۔ دھنیا مہری گرفتار ہوئی اسکا سر مونڈا گیا۔ بادشاہ کے دم سے انا جی کی امارت اور حکومت تھی۔ موت آب تربوز سے ہوئی۔

دربار

شاہی محل کی عالی شان عمارت کے وسط میں صدر مقام پر ایک نفیس بارہ دری بنی ہوئی ہے اور شیشہ آلات سے سجی ہوئی ہے نفیس جھاڑ نازک دیوار گیریاں قلمی تصویریں خوش خط قطعے لگے ہیں کمروں میں بانات کا فرش بچھا ہے سنہری روپہلی چلمنیں زربفت کے پردے پڑے ہیں۔ بارہ دری کے سامنے پر فضا چمن لگا ہے سنگ مرمر کی نہریں جن میں فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ شہ نشین میں صدر مقام پر کارچوبی گاؤ تکیہ لگائے ہوئے شاہ جمجاہ جلوہ افروز ہیں ان کے پہلو میں بڑے تزک و احتشام سے ملکہ زمانیہ تشریف فرما ہیں گرداگرد خواص ہالے کی طرح۔ اردلی کی خواص چنور اور مورچھل جھل رہی ہیں۔ ڈومنیاں مع سازندہ عورتوں کے بعد وبتا نہ اٹ کے سر بلبے شہر دا ہیں

گارہی ہیں۔ کوئی بلند آواز سے بات نہیں کر سکتا۔ نظر سے نظر ملانے کا حکم نہیں ہے۔ کسی کو کھنکارنے کی اجازت نہیں ہے۔ جو شخص کچھ کہتا ہے آنوجی (اُستانی) سر جُھکا کر بہ ادب عرض کرتی ہیں۔ اتنے میں داروغہ ڈیوڑھی نے خبر بھجوائی کوئی بی حُسینی خانم ہیں جنکو آنوجی صاحبہ نے محل کی ملازمت کے لئے طلب فرمایا ہے وہ ڈولی میں آئی ہیں کیا حکم ہوتا ہے ڈولی اُتروالی جائے یا نہیں۔ آنوجی نے کہا ہاں ہاں مجھسے بیگم صاحبہ نے فرمایا تھا چٹھی نویسی کے لئے آنے دو۔ باہر سے ایک خواجہ سرا ہمراہ آیا۔ بی حُسینی خانم کی سٹی بھول گئی یا الٰہی کس طرف جاؤں چاروں طرف اچھی پوشاک والی بیبیاں بڑے ٹھسّے سے بیٹھی ہیں۔ پہلے تو آنا گو دیکھکر سمجھیں کہ شاید یہی بادشاہ بیگم ہیں جھک کر سلام کیا۔ خواجہ سرا نے کہا آگے چلو۔ اب یہ قدم قدم پر فرشی سلام کرتی تھیں۔ اتنے میں دُور سے آنوجی آتے دکھائی دیں تو انکی جان میں جان آئی اُنہوں نے کہا چلو ہم تمہارا راستہ دیکھ رہے تھے بیگم صاحبہ سے تمہارا ذکر کر چکے ہیں۔ غرض سارے محل کے صدقہ ہوتی ہوئی بارہ دری کے زینہ سے تہہ خانہ کے اندر اُتریں۔ محلدار ساتھ ساتھ ہوئی۔ محلدار نے کہا سامنے بادشاہ اور بیگم بیٹھے ہیں۔ ذرا ادب اور قاعدے سے۔ پھر آگے بڑھ کے عرض کیا۔ سرکار عالیہ کے فرمان سے بی حُسینی خانم حاضر ہیں۔ نگہ رُوبرُو۔ حُسینی خانم نے نہایت ادب قاعدے سے سلام کیا اور بادشاہ کی خدمت میں اپنا لکھا ہوا خوشخط قطعہ نذر میں پیش کیا اور بیگم صاحبہ کو پانچ اشرفیاں نذر میں دکھائیں۔ بیگم صاحبہ کے اشارے سے قطعہ اور اشرفیاں آنوجی نے قبول کرلیں۔ بیگم صاحبہ

نے بیٹھنے کا حکم دیا اور سرفرازی کا خلعت منگوایا۔ کنیزیں دوڑی ہوئی بھاری خلعت کی کشتیاں لے کر حاضر ہوئیں۔ ایک دوشالہ بھاری ایک رومال سنہری جالیدار ایک تھان کمخواب کا ایک تھان سرخ اطلس کا ڈھاکہ کی جامدانی بنارسی دو دو پٹے مشروع کے دو تھان اور سونے کے کڑے مرحمت ہوئے۔ بادشاہ نے ایک ہزار کا توڑا منگوا کر انعام دیا اور پچاس روپے ماہوار پر چٹھی نویسوں میں اسم ہو گیا۔

دو گھنٹہ یہاں دل بہلا کر بادشاہ نے بوچہ (ایک سواری) طلب فرمایا۔ کہار باں لے کر حاضر ہوئیں۔ حضور سوار ہو گئے۔

ڈیوڑھی کے باہر کہاروں نے کندھا دیا۔ حضور دربار میں تشریف لائے۔ دربار کی کوٹھی رمنہ میں فرح بخش کے نام سے مشہور تھی۔ تخت شاہی یہیں رہتا تھا۔ جب سواری شاہی مراتب اور جلوس کے کوٹھی تک پہونچی سارے عملہ نے سروقد کھڑے ہو کر سلامی دی۔ معتمد الدولہ آغا میر وزیر منظفر الدولہ کپتان فتح علی خان اقبال الدولہ۔ مکرم الدولہ۔ مجد الدولہ۔ میر محمد سررشتہ دار عدالت نواب روشن الدولہ۔ افتخار الدولہ۔ مہاراجہ میوہ رام۔ راجہ امرت لال عرض بیگی مرزا کیوان جاہ نے باری باری مجرا کیا اور اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے بادشاہ نے تخت شاہی پر جلوس فرمایا۔ خدام دائیں بائیں چنور لئے کھڑے ہیں۔ پشت پر ایک خواص چھتر لگائے ہوئے ہے۔ درباری لوگ بہت ادب قاعدے سے نگاہیں نیچی کئے ہوئے خاموشی سے بیٹھے ہیں۔ پہلے معتمد الدولہ آغا میر نے ضروری کاغذات پیش کئے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ حضور نے بعد ملاحظہ دریافت طلب باتیں پوچھ کر دستخط

فرمائے پھر مقدماتِ عدالت پیش ہوئے روبکاری سماعت فرماکر احکام جاری کیے گئے۔ اتنے میں کیا مِردھے (نقیب) نے عرض کیا۔ شاہ عالمیاں نگاہ رُوبرُو نواب عاشق علی حاضر ہے۔ نگاہ رُوبرُو پہلی ڈیوڑھی کے چوکیدار نے کہا کہ سب چوکیدار یکے بعد دیگرے آواز دینے لگے۔ اس کے بعد رستم علی مِردھے نے بھی آواز دی نواب عاشق علی پھاٹک سے دوطرفہ سلام کرتے ہوئے جھکے جھکے چلے آتے ہیں۔ دربار رُعب سے کانپ رہے ہیں۔ راجہ امرت لال عرض بیگی نے ان کو سامنے لے جاکر عرض کیا۔ ملاحظہ ہو نواب عاشق علی حاضر ہے۔ نواب نے زمین دوز ہوکر مُجرا کیا دس اشرفیاں نذر میں پیش کیں۔ حضور نے اشارے سے قبول کیں۔ ۲۴ جنوری ۱۸۲۶ء کو پیش ہوئے نذر قبول ہوئی۔ اُسی روز خلعتِ سرفرازی مرحمت ہوا پانچسو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور عہدۂ سفارت مرحمت ہوا۔ اُسی روز کلکتہ جانے کا حکم ملا۔ تین لاکھ روپے نقد سرکار سے واسطے ضروریات کے مرحمت ہوا۔ اسی طرح نجم الدولہ جعفر علی خاں ابن مظفر علی خاں گوالیار سے آئے۔ بادشاہ نے خلعت مرحمت فرمایا اور عہدۂ توپ خانہ سلطانی عنایت ہوا۔ پانچسو روپیہ مہینہ مقرر ہوا۔

مرزا فریدوں بخت رفیع الدین حیدر

۸ جولائی سنہ ۱۸۳۷ء

مُنّا جان کے نام سے مشہور تھے اور شاہ نصیر الدین حیدر کی ایک منکوحہ

بیوی کے بطن سے تھے۔ بادشاہ انکی والدہ سے کسی بات پر ناراض ہوگئے اس لئے انکو ولی عہدی سے محروم کر دیا۔ باپ کے انتقال کے دوسرے دن جناب عالیہ بادشاہ بیگم (دادی) نے انکو لال بارہ دری میں تخت نشین کیا جو شاہان اودھ کی تاجپوشی کے لئے مخصوص تھی ایک مختصر لڑائی کے بعد رزیڈنٹ جنرل لو نے انکو معزول کر دیا۔ ان کو اور انکی دادی کو قلعہ چنار گڈھ مرزاپور میں تمام عمر نظر بند رکھا گیا اور تین سو روپیہ ماہانہ وظیفہ سرکار اودھ سے جاری رہا۔

جناب مولوی محمد مسیح الدین خاں بہادر نے لکھا ہے کہ اس لڑائی میں کم سے کم پانچ سو آدمی کام آئے اور تخت کے جواہرات لوٹ لئے گئے۔ منا جان کی تاجپوشی کی ایک قلمی تصویر اسی لال بارہ دری پر آویزاں ہے جو آجکل لکھنؤ کا عجائب گھر ہے۔

ابو الفتح معین الدین سلطان الزمان محمد علی شاہ

از ۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۲ء

منا جان کی معزولی کے بعد شاہ نصیر الدین حیدر کے چچا محمد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے ان سے ایک چوتھے عہد نامہ پر دستخط کروائے جسکی رو سے فوج میں خاصی کمی کر دی گئی اور ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی کہ بد نظمی کی صورت میں کمپنی سرکار کو اختیار ہوگا کہ بغرض درستی انتظام عارضی طور پر اودھ کا نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور بعد درستی انتظام سلطنت اودھ اس کے جائز

حقدار کو سونپ دی جائے۔
پانچ سال کی مختصر حکومت کے بعد محمد علی شاہ نے ۷ مئی ۱۸۴۲ء کو انتقال کیا اور حسین آباد مبارک میں دفن ہوئے۔
انکی تعمیر حسین آباد اور بازار حسین آباد ہے۔

دربار

بوجہ کبر سنی ان کے ہاتھ پاؤں رہ گئے تھے۔ دربار کی صورت یہ تھی کہ آٹھ بجے برآمد ہوتے۔ سونے کی پلنگڑی پر اجلاس فرمایا شہزادے امراء اہل دربار باریاب سلام ہوتے۔ نو بجے دربار برخاست ہوا۔ کچہری کے کاغذات عملے نے پیش کئے دوپہر تک دستخط ہوا کئے دوپہر کو خاصہ چنا گیا۔ خود معذور تھے۔ رفیق الدولہ نے خاصہ کھلایا ایک گھنٹہ قیلولہ فرمایا پھر خفیہ رپورٹیں سماعت کیں۔ قریب شام تامدان (ایک سواری) میں سوار ہو کر نواب ملکہ جہاں کے محل تشریف لیگئے۔

ثریّا جاہ حضرت سلطان زمان امجد علی شاہ

از ۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء

اپنے والد محمد علی شاہ کے جانشین ہوئے۔ یہ نہایت پارسا اور باشرع تھے۔ مذہبی امور کی طرف زیادہ رجحان تھا علماء کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ انہوں نے ایک دار العلوم جامعہ سلطانیہ اور مدرسہ سلطان المدارس قائم کیا انکے مختصر دور حکومت میں اور کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے۔

بہ عارضہ سرطان ۱۸۴۷ء میں انتقال کیا اور سلطین آباد حضرت گنج میں دفن ہوئے۔

انہوں نے جامعہ سلطانیہ۔ لکھنؤ کان پور والی سڑک بنوائی اور بازار حضرت گنج بنوایا۔

دربار

ان کا طریق دربار یہ تھا کہ صبح بوچہ (ایک سواری) پر محل سے برآمد ہوئے مع مختصر جلوس کے ہوا خوری کو تشریف لے گئے۔ آٹھ بجے دربار میں آئے۔ سب امرائے دولت نے حاضر ہو کر سلام کیا اپنے اپنے قاعدے سے بیٹھ گئے۔ مقربان خاص نے اپنی اپنی تقریر خوش سے محظوظ کیا انعام و اکرام ہوئے۔ درباری لوگ رخصت ہوئے۔ عدالت کے کاغذات ملکی و مالی پیش ہوئے۔ بارہ بجے کے بعد محلسرا تشریف لے جاتے تھے سہ پہر کو مدبر الدولہ محلسرا میں حاضر ہو کر کاغذات پیش کرتے تھے۔ شام کو پھر سوار ہو کر شہر کی حالت کا معائنہ فرماتے تھے کبھی مدرسہ سلطانیہ تشریف لیجاتے تھے۔ اس مدرسہ میں کئی ہزار طلباء پڑھتے تھے اور فی کس پانچ روپیہ ماہوار سرکار سے ملتا تھا۔ ایک ایک مدرس بیس بیس لڑکوں کو تعلیم دیتا تھا۔ آٹھ بجے سے چار بجے تک مدرسہ کھلا رہتا تھا۔

سلطان عالم محمد واجد علی شاہ

از ۱۸۴۷ء تا فروری ۱۸۵۶ء

اودھ کے نویں فرمانروا محمد امجد علی شاہ کے فرزند تھے۔ ۱۸۲۱ء میں

ملکہ کشور کے بطن سے پیدا ہوئے۔ وجیہہ اور خوبصورت تھے کاکلیں رکھتے تھے مونچھیں بڑی اور گھڑی تھیں۔ انتظامی اُمور میں اچھی دست گاہ تھی عنانِ حکومت ہاتھ میں آتے ہی مختلف طریقوں سے اصلاحات میں مصروف ہوگئے۔ عدالت پروری کا یہ حال تھا کہ جب باہر نکلتے تو سواری کے آگے آگے دائیں بائیں دو چاندی کے مکلّف صندوقچے دو ترک سوار لئے ہوئے چلتے حکم یہ تھا کہ جسکو کوئی شکائت ہو وہ اپنی عرضی ان صندوقچوں میں ڈال دے انکی کنجی اپنے پاس رکھتے اور خود کھول کر عرضیاں پڑھتے اور فوراً ہی دادرسی کرتے۔ اس کا نام مشغلہ تیر وانی رکھا تھا۔ گرمیوں کی تپتی ہوئی دھوپ میں نیل اینڈ لارنس لائین[1] کے مقابل میدان میں فوج سے خود قواعد لینے لگے اور فوج میں ایک نئی روح اور تنظیم پیدا کرنا چاہی جس سے رزیڈنٹ کو تشویش پیدا ہوئی آخر کار ایک دن بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور والا اتنی جانفشانی کیوں کرتے ہیں جبکہ خود سرکار انگلشیہ حضور کی سلطنت کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ بادشاہ نے کوئی توجہ نہ کی اور یہ سلسلہ جاری رکھا۔ یہ دیکھکر رزیڈنٹ نے جناب عالیہ یعنی بادشاہ کی والدہ سے وہی استدعا کی جو بادشاہ سے کی تھی۔ وہ دُور اندیش اور فہمیدہ خاتون تھیں بیٹے کو قواعد لینے سے روک دیا۔ قواعد لینے کی تصویر نواب سید فدا حسین صاحب وثیقہ دار کے پاس لکھنؤ میں تھی۔

سُلطان عالم نے اعلیٰ تعلیم پائی تھی اور علمی مذاق بھی نہائت اعلیٰ درجہ کا تھا۔ علمی لیاقت تمام سابق فرمانرایان سے بہت زیادہ تھی طبیعت میں سادگی اور انکساری تھی۔ متواضع تھے۔ طرز گفتگو اثنادلکش اور پُراثر

[1] موجودہ لکھنؤ چھاؤنی کا ایک میدان۔ ۱۲



ہز مجسٹی سلطان عالم محمد واجد علی شاہ

ہوتا کہ جسے ایک بار بھی شرف باریابی ہوتا اس میں محبت اور جاں نثاری کا جذبہ پیدا ہو جاتا۔ جس سے دو باتیں کر لیتے وہ گرویدہ ہو جاتا اور بار بار شرفِ باریابی کی تمنا رکھتا۔

ان میں صوم و صلوات کی پابندی تھی پرہیزگاری اور خدا پرستی تھی، رحم دلی اور فیاضی قدردانی اور تہذیب تھی۔ وہ وضع لباس طور طریق بول اور معاشرت میں قدیم اسلامی معاشرت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ انہوں نے زندگی بھر مے نوشی نہیں کی۔ مزاج میں حلم بہت زیادہ تھا کسی پر ناراض ہوتے تو کچھ نہ کہتے نرمی سے ایسی آداب آموزی کرتے اور سمجھاتے کہ پھر اس سے ایسی غلطی نہ ہوتی۔ کبھی کسی ملازم کو خواہ وہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ برا بھلا نہیں کہا۔ کبھی سخت یا ناشائستہ الفاظ انکی زبان پر نہ آئے۔ کبھی کسی ادنیٰ ملازم سے خوش ہوتے تو کہتے انہیں دو پیسے دیدو اسکے معنی دو اشرفیاں ہوتیں۔ ایسے انعام اپنے سامنے دلواتے تھے۔ عوام میں اتنے ہردلعزیز تھے کہ جانِ عالم کے پیارے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔

سرورِ خسروانِ عالم ہے سچ تو یہ ہے کہ جانِ عالم ہے

(حضرت شوق لکھنوی)

سلطانِ عالم نے سکندر باغ بنارسی باغ۔ قیصر باغ بنوایا۔ اور ایک چاندی کی بارہ دری بنوائی جس میں ساڑھے پانچ ہزار من چاندی صرف ہوئی اور یہ چاندی والی بارہ دری کہلاتی تھی۔ اپنے والد کا مقبرہ حضرت گنج میں بنوایا۔ اور اس کا نام سبطین آباد رکھا۔

دربار

کوٹھی فرح بخش قدیم بیت السلطنت شاہی کو چھوڑ دیا اور اپنا دربار

شہنشاہ منزل میں قائم کیا۔ کوٹھی فرح بخش قدیم میں محض اتوار کو دربار ہوتا تھا۔ تمام شہزادے اور امرائے دولت اور رفقاء حاضر رہتے تھے۔ بادشاہ تشریف لاکر دس بجے تک قیام فرماتے تھے۔ سلطنت کا کاروبار روزانہ ہوتا تھا۔ نواب امین الدولہ مہاراجہ معتمد الدولہ اور تدبیر الدولہ اہل دفتر خاص دولت خانہ قدیم (در دولت) پر تشریف لاتے تھے۔ دوپہر تک ملاحظہ کاغذات میں مصروف رہتے تھے۔ دوپہر کے بعد تخلیہ ہوجاتا تھا۔

انتظام سلطنت باقاعدہ تھا۔ سلطان عالم کے عہد تک شعبہ دار کام کی تقسیم تھی اور ہر شعبہ کے جداگانہ عملے اور دفتر تھے۔ دفاتر کے کھلنے بند ہونے کے اوقات مقرر تھے۔ دیوان خاص۔ دیوان عام۔ دفتر خزانہ۔ دفتر بیت الانشاء۔ دفتر وزارت۔ دفتر بیت الاجراء۔ بخشی گری۔ محکمہ صدر امانت۔ سررشتہ اخبارات۔ محکمہ عدالت عالیہ محکمہ کوتوالی۔ محکمہ مرافعہ۔ سررشتہ پولیس۔ محکمہ صیغہ بیت الضرب سررشتہ نزول۔ محکمہ جدید مقدمات قرض۔ محکمہ تنقیح مستغیثان۔ سررشتہ پرمٹ دوآب۔ سررشتہ آبکاری وغیرہ۔

دراصل اودھ میں کوئی بدنظمی نہ تھی۔ ۱۸۵۶ء تک سرحد سے آسام تک انگریزوں کا قبضہ ہوچکا تھا۔ درمیان میں ایک اودھ کی سلطنت باقی رہ گئی تھی جو گنجان آباد نہایت سرسبز و شاداب تھی۔ عہد ناموں کے علاوہ قانونی اور اخلاقی وجہ بھی قبضہ کرلینے میں مانع تھی۔ کئی سال سے اودھ لینے کے لئے کسی موزوں حیلہ کی تلاش میں کلکتہ میں کھچڑیاں پک رہی تھیں بالآخر یہ طے پایا کہ جہاں تک ممکن ہو بادشاہ کو اتنا بدنام اور رسوا کیا جائے اور ملک میں بدنظمی کو اتنی شہرت دی جائے کہ اودھ چھین لینے میں

دنیا انگریزوں کو غاصب اور ظالم نہ کہے۔ سلطانِ عالم کو رسوا کرنے کے عجب عجب طریقے اختیار کئے گئے۔ ارکان خاندانِ شاہی کو انکے خلاف کیا گیا جہاں اور بہت سے الزام انپر لگائے گئے وہاں ایک ناچنے کا الزام بھی لگا یا گیا بہرحال سلطانِ عالم کو رسوا کرنے میں انگریزوں کو پوری کامیابی ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ناواقفیت کے باعث آج تک لوگ واجد علی شاہ کو ایک عیاش بادشاہ کی حیثیت سے تو جانتے ہیں لیکن ان کی خوبیوں کا کسی کو علم نہیں۔

انکی بہت کچھ فرضی اور جھوٹی برائیاں طشت از بام کی گئیں حد یہ ہے کہ انکی لا تعداد جعلی قلمی تصویریں جابجا خاص وعام میں تقسیم کی گئیں جن میں وہ اپنے حرم کے غول میں کھڑے ہوئے ناچتے اور بھاؤ بتا رہے ہیں لیکن یہ تحقیق شدہ ہے کہ وہ کبھی اور کسی زمانہ میں نہیں ناچے ہو بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔

کثرت ازدواج اور موسیقی

سلطان عالم پر کثرت ازدواج کا الزام کسی حالت میں درست نہیں ان کا مذہب اثناء عشری تھا اور انکو اپنی شریعت سے اجازت تھی کہ بلا لحاظ تعداد ازدواج نکاح کر سکیں محل کی اعلیٰ وادنیٰ خدمت گزار عورتوں نیز گانے والیوں میں کوئی بھی ایسی نہ تھی جس سے متعہ نہ کیا گیا ہو۔ یہ تو انکی شریعت سے پابندی اور پرہیزگاری کی ایک کھلی ہوئی دلیل ہے۔ انہوں نے بجز اِن عورتوں یا مردوں کے کبھی کسی طوائف کا گانا نہیں سنا اسلام کے ابتدائی دور سے لیکر شاہان مغلیہ کے زمانہ تک منکوحہ بیبیوں

کے علاوہ تمام سلاطین کی حرم سرائیں سیکڑوں عورتوں سے بھری رہتی تھیں کنیزوں کا سلسلہ ممنوع ہونے کے بعد بھی ہندوستان کے مسلمان والیان ملک کی حرم سرائیں اسیطرح عورتوں سے بھری رہیں حالانکہ انکو بھی شرع سے چار سے بڑھاکر پانچ نکاح کرنے کی اجازت نہ تھی۔ مقام افسوس ہے کہ کسی نے بھی ان والیان ملک پر اعتراض نہ کیا۔ مجموعی حیثیت سے سُلطان عالم مرحوم کی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ان میں بعض ایسی خوبیاں ملیں گی جو گزشتہ چند صدی پہلے کے کسی مسلمان فرمانروا میں نہ ملیں گی۔

دوسرا الزام سلطان عالم پر موسیقی کا لگایا گیا اسکی اصلیت یہ ہے کہ انکو قدرتی طور پر ابتدائے عمر سے موسیقی سے دلی رغبت تھی اور اسیوجہ سے انھوں نے اس فن کو فن کی حیثیت سے حاصل کیا تھا۔ تاریخ ہند میں کئی مسلمان بادشاہوں کا موسیقی میں کامل ہونے کا تذکرہ ہے لیکن ان میں سے کسی کو بھی اتنی اعلیٰ درجہ کی معلومات نہ تھی جتنی سلطان عالم کو تھی۔ اس فن کے بے مثل استاد ہونے کے باعث رقص و سرود میں بھی انکو اتنی تمیز اور دخل تھا کہ جب کسی ماہر فن سے غلطی ہو جاتی تو فوراً ٹوک دیتے اور تصحیح کر دیتے۔ شروع سے اخیر عمر تک باکمال اور مشہور ماہر فن انکی سرکار سے وابستہ رہے باوجود اس قدرتی لگاؤ اور ذوق کے وہ دن رات اس میں مشغول نہیں رہتے تھے بلکہ اس کا بھی ایک وقت ہوتا تھا۔ ان کے اس عیب کو ایک عیب تسلیم بھی کر لیا جائے اور ان سے پیشتر کے مُسلمان بادشاہوں سے ان کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سلطان عالم میں تو بس یہی ایک عیب تھا لیکن وہ سب کتنے عیوب سے آلودہ تھے۔ آج کی مہذب دنیا میں موسیقی ایک لازمہ حیات ہے۔ کیا قباحت ہوئی اگر سلطانِ عالم سو سوا سو برس پہلے

اس غذائے روحانی سے فیض یاب ہوتے رہے۔
ان کے عہد میں لکھنؤ اعلیٰ درجہ کے کاملین فن کا مرکز ہو گیا تھا اور کتنے باکمال اہل فن اور عوام کی پرورش ہوتی تھی اور ملک کی دولت ملک ہی میں رہتی تھی رہس خاص برج اور متھرا کا فن ہے۔ بادشاہ کی طبیعت اہل ہنود کے رہس کی طرف متوجہ ہوئی۔ بادشاہ نے سری کرشن جی کا رہس دیکھا تھا جسکے سامان میں کئی لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ اس رہس سے خود اپنا ڈرامہ ایجاد کیا۔ مثنوی ماہ پیکر اور غزالہ کی تصنیف سے رہس کی بنیاد پڑی۔ اسکو دیکھتے ہی عوام میں اس کا خاص شوق پیدا ہوا کہ عاشقانہ قصے جو ان دنوں پریوں کے حسن و عشق سے وابستہ تھے عملی صورت میں دکھائے جائیں۔ پبلک کا رجحان دیکھکر امانت لکھنوی نے ۱۸۵۳ء میں اندر سبھا تصنیف کی۔
یہ اردو کا سب سے پہلا ڈرامہ ہے جو موسیقی آمیز طربیہ ہے جس میں ہندوؤں کی دیومالا میں مسلمانوں کے فارسی مذاق کی آمیزش کا پہلا نمونہ نظر آیا۔ اس سے ڈرامہ اور تھیٹر کی بنیاد پڑی۔ یہ ڈرامہ نہ تو واجد علی شاہ کے حکم سے تیار ہوا نہ انہوں نے کبھی اس میں حصہ لیا اور نہ کبھی یہ تماشہ قیصر باغ میں ہوا اور نہ بادشاہ کبھی اس میں شریک ہوئے باوجود اس کے کہ اور فنون و کمالات بھی عروج پر تھے۔ موسیقی کے لحاظ سے یہ عہد زریں عہد تھا۔ لے ایک اہم جزو موسیقی ہے جو کم و بیش ہر شخص میں پایا جاتا ہے اسکا مادہ بادشاہ میں بہت تھا۔ شعراء نے جو اوزان مقرر کئے ہیں وہ بھی لے سے تعلق رکھتے ہیں۔ علم عروض در اصل مکمل لے ہے۔ یہ بدیہی امر ہے کہ جس شخص میں فطرتاً لے کا مادہ بڑھا ہوا ہوگا اسکے ہر عضو اور بن مو سے حرکتِ بے اختیاری و ربودگی پیدا ہو جائے گی اور ہر لے پر ہر عضو پھڑکنے

لگے گا۔ عوام کی نظر میں یہ حرکت ایک مہمل اور بے وقعت معلوم ہوتی ہے لیکن وہ شخص جس سے سرزد ہوتی ہے مجبور ہے۔ جو لوگ اصول موسیقی سے واقف ہیں وہ اسے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ تڑنت جسے بھاؤ بتانا کہتے ہیں یہ بھی علم موسیقی کا ایک جزو ہے۔ انگریزی میں اسے موشن کہتے ہیں۔ تھامس اسپیکر وڈلر وغیرہ میں یہ پایا جاتا ہے۔ اسی طرح لے داری بھی اسکی ایک صنع ہے جسکا کمال واجد علی شاہ میں تھا مگر لاعلمی کی وجہ سے یہ معلومات کا کمال انکی بدنامی کا باعث ٹھہرایا گیا۔

شاہان اودھ اہل ہنر کی حوصلہ افزائی میں اس لئے دلچسپی لیتے تھے کہ ہنر معدوم نہ ہونے پائے۔ سلطان عالم ستار ایسا بجاتے تھے کہ رودنے لوگ ہنس دیتے تھے اور ہنستے رو دیتے تھے۔

قلمروئے اودھ سے ممالک مغربی و شمالی (موجودہ صوبہ متحدہ) کے جن اضلاع کی سرحدیں ملتی تھیں ان کے ڈپٹی کمشنروں سے انگریزی حکومت نے دریافت کیا کہ آیا اودھ کے باشندے بدنظمی کی وجہ سے انکے اضلاع میں پناہ لینے کے لئے داخل ہو رہے ہیں لیکن ہر ضلع کے ڈپٹی کمشنر نے نفی میں جواب دیا اور چند نے لکھا کہ انگریزی علاقہ سے جتنے لوگ بغرض تجارت و ملازمت اودھ جاتے ہیں اس سے بہت کم لوگ اودھ سے عارضی طور پر ان کے اضلاع میں آتے ہیں۔

۱۸۵۵ء میں رزیڈنٹ جنرل اوٹرم نے اودھ کے دورے کا پروگرام بنایا شہروں قصبوں اور دیہاتوں کا دورہ کیا اپنے اثر و اقتدار سے دباؤ ڈالکر بعض خواندہ ناخواندہ لوگوں سے ایسی عبارت پر دستخط لئے

جسکے معنی یہ تھے کہ سلطنت اودھ قلمروئے انگلشیہ میں شامل کی جائے
اوٹرم نے دورہ ختم کرنے کے بعد ایک رپورٹ مرتب کی جو کئی صفحوں پر
مشتمل تھی جس میں فرضی بدانتظامی کی داستانیں تھیں اور الحاق اودھ کے
لئے اپنی سفارشات۔ اسی رپورٹ میں وہ دستخطی فہرست بھی منسلک کرکے
ڈلہوزی کے پاس کلکتہ بھیجدی۔

ڈلہوزی نے ۱۸۵۶ء میں بادشاہ پر عیش پرستی اور ملک میں بدانتظامی
کے الزامات لگاکر بادشاہ کو معزول کرنے کا حکم اوٹرم کو بھیجدیا۔ ادھر
انگریزی فوج کو قلمروئے اودھ کی حدود پر تعیناتی کے احکام جاری ہوگئے
۲۶ فروری ۱۸۵۶ء کو پچھلی رات سے لکھنؤ کی سڑکوں پر گوروں کے
پہرے لگے ہوئے تھے جو ریزیڈنسی سے بھیجے گئے تھے۔ صبح ہوتے ہی
لوگ انہیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اسی دن معزولی کا حکم اور ایک
نیا عہدنامہ لیکر اوٹرم بادشاہ کے پاس آئے اور یہ دونوں چیزیں بادشاہ
کے سامنے پیش کردیں۔ عہدنامہ کا لب لباب یہ تھا۔

(۱) بادشاہ کا خطاب ہز مجسٹی بدستور قائم رہے گا۔ (۲) انکی عزت
و توقیر بدستور سابق قائم رہے گی ——— (۳) بادشاہ
کے محلات باغات ذاتی املاک اور جاگیریں بدستور ان کے تصرف
میں رہیں گی نیز اپنے محلات وغیرہ میں انکو ہلکی سزا دینے کا بھی اختیار ہوگا
(۴) مملکت اودھ کا انتظام درست کرنے کے لئے عارضی طور پر سرکار کمپنی
کے افسران مقرر کئے جائینگے جنکی تنخواہیں صوبۂ اودھ کے خزانہ سے
دی جائینگی اور اسکا باقاعدہ حساب رکھا جائیگا انتظامی حالات درست
ہونے پر سلطنت اودھ اسکے جائز حقدار کے حوالہ کردی جائیگی (۵)

بادشاہ کے ذاتی مصارف کے لئے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اور تین لاکھ روپیہ سالانہ شاہی لوازمات برقرار رکھنے کے لئے کمپنی سرکار پابندی سے ادا کرتی رہے گی۔ اگر بادشاہ کے نزدیک یہ رقم کم ہو تو حسبِ دلخواہ اضافہ کر دیا جائے گا۔

اوٹرم کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ اگر بادشاہ کو مذکورہ شرائط منظور نہ ہوں تو انکو انکے حسبِ دلخواہ اتنا وقت دیا جائے کہ وہ اپنا کل مال واسباب جو وہ اپنے ساتھ لے جانا چاہیں لیکر کلکتہ روانہ ہوں۔

بادشاہ نے نئے عہد نامہ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد ہی معزولی کی خبر ہر طرف پھیل گئی اور گورنر جنرل کی طرف سے بحیثیت چیف کمشنر اودھ اوٹرم نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی جس سے دارالسلطنت لکھنؤ اور پورے اودھ میں سراسیمگی اور ہیجان پیدا ہو گیا۔ لوگوں کے چہروں پر حزن وملال برسنے لگا۔

بادشاہ نے معزولی کا حکم سُنکر بہت کچھ عذر معذرت کی اور جب اس کا کوئی اثر نہ ہوا تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

کون ہے جسکو مصیبت پر رونا نہیں آتا۔ مگر ان کا رونا بھی مضحکہ کے قابل سمجھا گیا اور مورخوں نے لکھ دیا کہ شاہِ اودھ بچوں کی طرح رونے لگے۔

پسِ پردہ بادشاہ کی والدہ نے بھی رزیڈنٹ سے گفتگو کی لیکن وہ بھی بے نتیجہ رہی۔

دس سال کی حکومت میں ہندو مسلمان اتنے خوش تھے کہ جان فدا کرنے کو تیار رہتے تھے۔ اہلِ فوج اور صاحبِ ثروت تعلقہ دار۔ راجہ مہاراجہ لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے تھے۔ بالآخر والدہ اور رفقائے خاص کے مشورے

سے یہ طے پایا کہ آئینی طریقوں سے واگذاری کی کوشش کی جائے اس لئے کہ جنگ کا نتیجہ معلوم ہے اور ملک تباہی بربادی سے بچ جائے گا۔ طلبی پر مولوی مسیح الدین خان بہادر نے بھی واپسی سلطنت کے لئے آئینی طریقوں کو ترجیح دی اور کہا کہ شاہ عالم پناہ اگر وظیفہ میں اضافہ چاہیں تو وہ حسب دلخواہ اضافہ کی کوشش کریں لیکن بادشاہ نے جواب دیا کہ میں دریوزہ گری کروں گا لیکن نقدی زنہار قبول نہیں کروں گا پھر محمد مرح سے اپنے ساتھ کلکتہ چلنے پر اصرار کیا جسے چار و ناچار انہوں نے منظور کر لیا۔ رفقاء و جانثار ہمراہی کے لئے تیار ہونے لگے محلات میں روانگی کے لئے اسباب بندھنے لگے۔

چلتے وقت یہ شعر پڑھا

؎ در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں۔ خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

روانگی کے وقت کوئی ایسا نہ تھا جس پر رقت طاری نہ ہوئی ہو اور زار و قطار نہ رو رہا ہو۔

بادشاہ تو چلے گئے مگر انکی یاد ہر ادنیٰ و اعلیٰ کے قلب و جگر پر نشتر کا کام کر رہی تھی۔

شاہی گاڑی محل سے بر آمد ہوئی جسے انگریز کوچ مین چلا رہا تھا۔ ایک جم غفیر بادشاہ کے رخصتی دیدار کا منتظر تھا۔ اس موقع پر شاہ معزول نے ایک پُر درد اور مختصر تقریر کی اور کہا کہ میں نے دس برس آپ پر حکومت کی ہے میری وجہ سے آپ میں سے کسی کو کوئی تکلیف پہونچی ہو تو وہ معاف کر دیجئے۔ خدا کو منظور ہوا اور قسمت نے ساتھ دیا تو آپ سے پھر ملوں گا۔

یہ سُنتے ہی اہلِ مجمع دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

بادشاہ نے خدا حافظ کہا اور شاہی قافلہ سوئے کانپور روانہ ہوا جہاں ۲ دو

کوٹھیاں بادشاہ اور انکے ہمراہیوں کے لئے خالی تھیں۔

اپنے محبوب شاہ کی عقیدت اور محبّت میں ہزارہا لوگ کانپور پہنچ گئے جن میں دو سو دوکاندار بھی تھے جو اپنی اپنی دوکانیں لے گئے تھے ان میں میاں محمّد و لکھنؤ کے مشہور نہاری فروش بھی تھے۔

دورانِ قیام کانپور لکھنؤ سے اسباب و خزانے پہنچتے رہے۔

جب شاہ موصوف کانپور سے جانبِ الٰہ آباد روانہ ہوئے تو راستہ میں گاڑی کے پہئے دلدل میں پھنس جاتے تھے۔ بادشاہ نے گاڑی سے اُتر کر خود پہیوں میں زور لگایا۔ اُس موقع پر یہ شعر کہا تھا

؎ زمانہ تھا ایسا کرتے تھے گوہر پاؤں کے نیچے۔ یہاں یہ دھوپ ہر پڑا کنکر پاؤں کے نیچے

الٰہ آباد میں چند دن قیام کرنا تھا۔ وہاں ایک ہندوستانی عیسائی کا پُرانا مکان ملا جسکی چھتیں اتنی بوسیدہ تھیں کہ ان سے دھوپ چھنتی تھی اور شام کو کمروں میں ابابیلیں بسیرا لیتی تھیں۔ بادشاہ کا کمرہ نسبتاً بہتر تھا لیکن ایک کونے میں اسکی چھت سے بھی دھوپ آتی تھی۔

بوقت روانگی داروغہ نے مالکِ مکان سے کرایہ دریافت کیا۔ اس نے دو سو روپے مانگے جو مکان کی حیثیت اور ۳ چار دن کے قیام کے لئے اسوقت بہت زیادہ تھا۔ داروغہ نے کرایہ نہیں دیا۔ بادشاہ بےخبر تھے۔ جب سواری سڑک پہ آئی تو معلوم ہوا کہ مالک مکان نے سڑک کے کنارے دو طرفہ درختوں میں رسّہ بندھوا کر راستہ روک دیا ہے۔ بادشاہ نے اسی وقت دو سو روپیہ کرایہ دلوا دیا۔

اب یہ قافلہ جانب بنارس روانہ ہوا کہ مہاراجہ بنارس نے بڑی عقیدت سے بادشاہ کو بنارس آنے کی دعوت دی تھی (عہد نواب شجاع الدولہ و آصف الدولہ

ہیں والیان بنارس سلطنت اودھ کے باج گذار تھے۔ بنارس اور آگرہ آباد وغیرہ اودھ میں شامل تھے) مہاراجہ نے بادشاہ کے شایانِ شان انکی خاطر و تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ایک نفیس اور آراستہ کوٹھی شاہ اور انکے عملہ کے لئے موجود تھی۔ سفر کی تکان اور صعوبتیں یہاں کے قیام سے دُور ہو گئیں۔ طبیعتیں بشاش و شگفتہ ہو گئیں۔

بادشاہ نے مہاراجہ کی خاطر مدارات کی بہت تعریف لکھی ہے۔

مہاراجہ اودھ کی ضبطی سے اتنے متاثر تھے کہ اُس سال ہولی کا تہوار نہیں کیا۔

چلتے وقت بادشاہ نے مہاراجہ کو سوا لاکھ روپیہ ہاتھی کے نام سے دیا اور کہا کہ اب میں کسی قابل نہیں رہا۔ جو محبت و خلوص آپ نے میرے ساتھ برتا ہے یہ ہمیشہ یاد رہے گا۔

بنارس سے یہ قافلہ براہ دریائے گنگا کلکتہ روانہ ہو گیا۔

کلکتہ پہونچکر ابتدا میں مہاراجہ بردوان کی کوٹھی پانچسو روپے ماہوار کرایہ پر لی گئی۔ اس کے بعد موچی کھولا (مٹیا برج) میں قیام ہوا۔

لکھنؤ کے واقعات مابعد

محلات سے کل سامان منتقل کرنا ممکن نہ تھا۔ نادر اشیاء مثلاً بیش قیمت شیشہ آلات جھاڑ۔ فانوس۔ قالین۔ پردے۔ ظروف وغیرہ اور بہت سی قیمتی اشیاء رہ گئیں۔ کچھ انگریز لے گئے باقی نیلام کر دی گئیں۔ کوہ پیکر ہاتھی بے مثل گھوڑے۔ دو لاکھ نایاب و خوبصورت کبوتر۔ بے شمار جانور نیلام

کر دیئے گئے چینی کے ظروف بمبئی میں دو جہازوں پہ بار کرکے لندن بھیجے گئے لندن میں اُتارے گئے تو نصف ٹوٹ گئے تھے اس ٹوٹی ہوئی چینی سے لندن کی مشہور سڑک بیک اٹڈلی کے فوٹ پاتھ بنائے گئے۔

قلعہ مچھی بھون میں بیگمات کے پردے کا لحاظ کئے بغیر کیپٹن کورنگی ہمراہیوں کے ساتھ دڑانہ داخل ہوئے۔ صندوق توڑ کر قیمتی اشیاء شالیں رہائیاں جامہ دار جواہر نگار زیورات اور پازیب لعل بدخشاں لے گئے۔ بیگمات کو قلعہ سے باہر نکال دیا اور سب اسباب لوٹ لیا۔ شاہی عمارتیں اور لکھنؤ کھدنے لگا۔ سڑکیں نکلنے لگیں۔

سلطان عالم خود انگلستان جا کر واگذاری سلطنت کی کوشش کرنا چاہتے تھے جسکی اجازت بھی مل گئی تھی۔ مٹیا برج میں تھوڑے ہی دن قیام کے بعد علیل ہو گئے بیماری نے طول کھینچا نقاہت بہت بڑھ گئی۔ مجبوراً اپنی والدہ ملکہ کشور صاحبہ بھائی مرزا اسکندر حشمت جنرل صاحب اور ولی عہد کیواں قدر مرزا محمد حامد علی بہادر کو بہ سفارت مولوی محمد مسیح الدین خان بہادر استردادِ سلطنت کی کوشش کے لئے انگلستان روانہ کیا۔ نصف جہاز ریزرو کیا گیا سو آدمی اس قافلہ میں تھے۔ پانچسو بکس مع دیگر سامان کے تھے۔ بادشاہ نے بصد حسرت و یاس سبکو رخصت کیا۔

ملکہ کشور ملکہ وکٹوریہ کو نذر کرنے کے لئے بیش بہا جواہر بے بہا ساتھ لے گئی تھیں جو ایک طلائی خاصدان میں تھے۔ جب جہاز مارسیلز پہنچا تو عملہ میں چرچا ہونے لگا کہ خاصدان سمندر میں گر گیا۔ غوطہ خوروں نے سمندر کی تہہ تک غوطے لگائے لیکن خاصدان نہ ملا۔ واللہ عالم کیا ہو گیا۔

جہاز انگلستان پہنچا۔ لنگر انداز ہوا۔ فوٹوگرافر کیمرے لیکر پہنچ گئے۔

ایک اژدہام ملکہ کشور کی سواری دیکھنے کے لئے جمع تھا۔ ملکہ جہاز سے اتر کر پالکی پر سوار ہوئیں۔ سرکاری طور پر شاہی اعزاز کے ساتھ انکو سلامی دی گئی مجمع نے بھی سلامی دی۔ سرکاری طور پر آنکی بڑی عزت اور خاطر مدارات ہوئی ہارلی ہاؤس لندن میں قیام کیا۔

ملکہ وکٹوریہ نے ملکہ کشور کے اعزاز میں دعوت دی جس میں مرزا اسکندر حشمت ولی عہد مرزا محمد حامد علی اور انگلستان کے شاہی خاندان کی خواتین شریک ہوئیں ملکہ وکٹوریہ نے ملکہ کشور سے کہا کہ پردے کے خیال سے میں نے اپنے بیٹے ایڈورڈ ہفتم کو دعوت میں نہیں بلایا۔ ملکہ کشور نے کہا۔ بلا لیجئے میں ان سے پردہ نہیں کروں گی۔ جیسے آپ کا بیٹا ویسے میرا۔ چنانچہ ایڈورڈ ہفتم بھی دعوت میں شریک ہوئے۔

ملکہ وکٹوریہ نے کہا کہ واقعی آپ کے ساتھ بڑی بے انصافی کی گئی ہے مجھے آپ سے آپکے بیٹے شاہ معزول سے آپ کے خاندان سے دلی ہمدردی ہے لیکن میں نے کبھی اپنے شاہی اختیارات سے کام نہیں لیا اس لئے مجبور ہوں البتہ وزیر اعظم سے کہوں گی کہ وہ پارلیمنٹ کے ممبران کو آپ کی ہمدردی پر آمادہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ میری یہ سعی آپ کے لئے ضرور مفید ہوگی۔

وزیر اعظم برطانیہ مسٹر گلیڈ اسٹون نے مولوی مسیح الدین خان بہادر کے اعزاز میں ڈنر دیا جس میں ہاؤس آف لارڈز (ایوان خاص) اور ہاؤس آف کامنس (ایوان عام) کے بہت سے ممبران شریک ہوئے۔ مسٹر گلیڈ اسٹون مولوی صاحب موصوف کو یور اکسلنسی سے مخاطب کرتے اور سرکاری تحریروں میں بھی یہی القاب لکھا جاتا۔

مولوی صاحب بڑے بڑے صاحب اقتدار انگریزوں سے ملے

شاہِ معزول پر ظلم کی کیفیت بیان کی اور انکو اپنے موافق ہموار کیا۔ سلطنتِ اودھ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد ناموں۔ انگریزوں پہ شاہانِ اودھ کے احسانات اور الحاق کا تذکرہ مختلف عنوانوں سے پمفلٹ کی شکل میں چھپوا کر ممبرانِ پارلیمنٹ اور پبلک میں تقسیم کروایا۔ اس سے خاص و عام واگذاری اودھ کی حمایت اور شاہ معزول سے ہمدردی ظاہر کرنے لگے یہاں تک کہ ایوان عام اور خاص کے تقریباً کل ممبران واگذاری کے حق میں تھے۔ قریب تھا کہ واگذاری کا اعلان ہو جاتا کہ ایک ممبر بول اٹھے لارڈ ڈلہوزی راستہ میں ہیں وہ آجائیں تب یہ معاملہ طے کرنا زیادہ انسب ہوگا۔ اس کے بعد ہی لکھنؤ اور حوالی لکھنؤ بادشاہ کو واپس کرنے کی پیش کش کی گئی جسے ملکہ کشور نے منظور نہیں کیا اور پوری سلطنت کی واپسی کے مطالبہ پہ قائم رہے۔

ڈلہوزی راستہ میں تھے کہ ہندوستان میں غدر ہو گیا۔ لکھنؤ اور اودھ میں قیامت برپا ہو گئی۔ بے شمار انگریز مارے گئے۔ لکھنؤ ریذیڈنسی میں ان کی عورتیں اور بچے قتل کئے گئے۔

ان واقعات سے وزیر اعظم برطانیہ اور ممبرانِ پارلیمنٹ کی ہمدردیاں واگذاری اودھ سے کم ہو گئیں۔

شاہِ معزول پہ کیا گذری

سال بھر کے بعد خدا نے صحت بخشی عملہ اور غربت میں ساتھ دینے والوں نے خوشی کا جشن منایا جشن کے بعد سوتے ہی شاہِ معزول کی قیام گاہ کو گوروں کی فوج نے گھیر لیا۔

گورنر جنرل کے سکریٹری بادشاہ سے ملے اور کہا کہ دراصل آپ پر کسی قسم کی بدگمانی نہیں ہے لیکن بعض باغیوں کے بیان سے آپ پر اشتباہ ہوتا ہے اس لئے مناسب ہے کہ آپ چند دن قلعہ ولیم میں رہیں۔ کوئی عذر نہ سُنا گیا۔ صرف آٹھ مصاحبوں کے ساتھ جانے کی اجازت ملی قلعہ میں چند روز کے بعد گورنر جنرل کا ایک خط ملا۔ مضمون یہ تھا۔ کہ بعض باغیوں نے آپ کا نام لیا ہے اس لئے مصلحت یہ ہے کہ آپ کچھ عرصے یہاں قیام کریں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی اور حتی الامکان آپ کی راحت اور آرام کا انتظام کیا جائے گا۔

بادشاہ قلعہ میں نظربند تھے ان پہ دباؤ ڈالنے کا یہ ایک اچھا موقع تھا۔ گورنر جنرل نے ان کو مجبور کیا کہ وہ فی الحال استردادِ سلطنت سے دست بردار ہو کر مولوی مسیح الدین خان بہادر کو بذریعہ تار اسکی اطلاع دیدیں۔ شاہ معزول سے اسی مضمون کا تار بھجوایا گیا۔ مولوی صاحب کو جب یہ تار ملا تو انہوں نے وزیر اعظم مسٹر گلیڈاسٹون کو لکھا کہ بادشاہ نظربند ہیں ایسی حالت میں انکی اس قسم کی تحریر قانوناً جائز نا درست نہیں۔ دوبارہ بادشاہ کی طرف سے پھر اسی مضمون کا تار ملا جس سے مولوی صاحب مایوس ہو گئے۔ ملکہ کشور انکے صاحبزادے اور پوتے بھی دل شکستہ ہو گئے۔

ملکہ کشور سبکو ساتھ لیکر پیرس گئیں۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا سمجھکر شاہ فرانس سے انکی ملاقات کا انتظام کیا گیا۔ شاہ فرانس ایک ہال میں شہ نشین پہ بیٹھے جسکے سامنے سرخ مخمل کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ ملکہ کشور انکے صاحبزادے اور پوتے پردے کے پیچھے تھے۔ مولوی صاحب نے ملکہ کی طرف سے استردادِ سلطنت کے لئے شاہِ فرانس کی امداد و اعانت نیز سرکار انگلشیہ سے سفارش کی درخواست کی۔ شاہ نے جواب دیا۔ میری دلی خواہش ہے کہ دنیا

کی سب قومیں اپنے مقصد میں کامیاب ہوں اور ترقی کریں۔ یہ ایک مبہم جواب تھا
پیرس میں قیام کے دوران آفت کی ماری فلک کی ستائی ملکہ بے حد شکستہ دل ہوگئیں۔ اسی صدمہ میں بیمار پڑیں اور انتقال کر گئیں۔ جنازہ شاہی اعزاز کے ساتھ اٹھا۔ حکومت فرانس نے بھی نمایاں حصّہ لیا۔ ملکہ کو بصد حسرت و یاس انکے صاحبزادے اور پوتے نے دفن کیا۔

مرزا سکندر حشمت بھی بہت دل گرفتہ تھے۔ انکے ایک ناسور تھا جب تک بہتا رہتا طبیعت اچھی رہتی اور جب بہنا موقوف ہو جاتا بگڑ جاتی۔ والدہ کے انتقال کے بعد ناسور کا بہنا بند ہو گیا۔ حالت بگڑی اور ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ والدہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ دونوں قبروں کے لئے تین تین ہزار پونڈ کی زمین لی گئی۔ دونوں قبریں سنگ مرمر کی بنائی گئیں۔ دونوں جنازوں اور قبروں کی تصویریں مولوی صاحب کے کتب خانہ میں تھیں جو بوجوہات تلف ہو گئیں۔ مولوی صاحب نے مرزا سکندر حشمت کی تعریف میں لکھا ہے کہ اتنے اوصاف ایکجا کسی ایک شخص میں انہوں نے نہیں پائے۔

شاہ معزول والدہ اور بھائی کے انتقال سے بے تاب و بے قرار ہو گئے۔

ولی عہد مع عملہ کے کلکتہ روانہ ہوئے۔ ملکہ کشور کی مصاحب خاص بہار النساء مکہ معظمہ چلی گئیں۔

سلطان عالم کی پہلی ملکہ نواب عالم آرا بیگم نے مدت العمر موصوف کا تمام خرچ پورا کرنے کا ذمہ لیا تھا اور کہا تھا کہ انگریزوں سے وظیفہ قبول نہ کیا جائے۔ ممکن ہے قلعہ کی نظر بندی کے ایام میں وظیفہ قبول کرنے پر بادشاہ کو مجبور کیا گیا ہو۔

شاہ مذکور کے نواسہ پرنس بہرام علی مرزا کا بیان ہے کہ وظیفہ ملتا رہا لیکن کسی عہد نامہ پر دستخط نہیں کئے گئے واللہ اعلم۔ بہرحال جب تک بادشاہ زندہ رہے ایک لاکھ روپیہ مہینہ ملتا رہا لیکن خرچ کئی لاکھ روپے مہینہ کا تھا۔

واجد علی شاہ لکھنؤ سے کلکتہ گئے۔ لکھنؤ اُجڑ گیا لیکن دریائے ہگلی کے کنارے ایک چھوٹا لکھنؤ آباد ہو گیا جو عہدِ شاہی کے لکھنؤ کا زندہ نمونہ تھا سربفلک کوٹھیاں۔ محلات۔ باغات وغیرہ اِس عالمِ غربت میں شاہی دربار دلی کا ثبوت دے رہے تھے۔ لکھنؤ کے منتخب صاحبانِ کمال وہاں جاکر بس گئے تھے۔ ایک مدت کے بعد سلطانِ عالم کو لکھنؤ دیکھنے کی پیش کش کی گئی تھی جو انہیں گوارا نہ ہوئی۔

معزولی کے بعد سر پر کبھی تاج نہیں رکھا مسلا کی دو پلّی ٹوپی دیتے تھے جب کلکتہ کی سیر کو جاتے گاڑی کے آگے پیچھے سوار ہوتے تھے۔ ایسے موقع پر بجائے ٹوپی کے شالی رومال لپیٹ لیتے تھے۔

آخری عمر میں کاکلیں ترشوا دی تھیں اور داڑھی رکھ لی تھی۔ اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ زیادہ تر یونانی علاج ہوتا اور کبھی ڈاکٹری۔

حضرت سلطانِ عالم سکندر جاہ مرزا محمد واجد علی شاہ نے ۲۱ ماہ ستمبر ۱۸۸۷ء مطابق ۱۳۰۵ھ کو اس دنیا سے رحلت فرمائی اور سبطین آباد مٹیا برج میں دفن ہوئے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ آخری شخص تھے جو زندگی بھر بادشاہ کہلائے۔ انکے بعد یہ خطاب پھر کسی کو نصیب نہ ہوا۔

خلد آشیاں حضرت سلطانِ عالم کے جیتے جی برٹش گورنمنٹ نے ان کی

عزت اور احترام بدستور قائم رکھا لیکن انتقال ہوتے ہی لارڈ ڈفرن کی حکومت نے سب کوٹھیوں اور محلات پر پہرہ لگا دیا۔ ترکہ کا یہ حشر ہوا۔ محلات کوٹھیاں شاہی املاک۔ باغات۔ رمنے۔ زندہ جانوروں کا عجائب خانہ سب نیلام کر دیئے گئے۔ اور ترکہ ورثہ میں نقد تقسیم کیا گیا۔ مٹیا برج کھنڈ کے تباہ و برباد ہوگیا انتقال کے وقت سلطان عالم کے صاحبزادوں میں جو بقید حیات تھے ان میں سب سے بڑے مرزا قمر قدر بہادر کو چار ہزار اور مابقی کو پانچ سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔ صاحبزادیوں کو ڈھائی سو روپے۔ سب سے چھوٹے صاحبزادے افسر الملوک پرنس اکرم حسین بہادر کی کوشش سے شہزادوں کا وظیفہ پندرہ سو روپے ہوگیا تھا لیکن اسوقت صرف چند ہی شہزادے بقید حیات تھے۔

نومبر ۱۹۳۶ء میں وکٹوریہ پارک اور اسکے اطراف میں لکھنؤ کی تاریخ میں انگریزی عہد کی بے مثل اور عظیم الشان نمائش ہورہی تھی جس میں تمام ہندوستان کے مختلف اشیاء اور مصنوعات کے اسٹال لگائے گئے تھے اور بے شمار دلچسپیاں تھیں۔ لاکھوں آدمی باہر سے نمائش دیکھنے آتے تھے انہیں ایام میں غالباً زندگی میں پہلی بار پرنس موصوف لکھنؤ آئے تھے گورنر نے ممدوح سے نمائش دیکھنے کی استدعا کی چنانچہ تھوڑی دیر کے لئے نمائش میں آئے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ پرنس اکرم حسین بہادر نے اپنی والدہ کی خدمت کے پیش نظر تمام عمر عقد نہیں کیا اور بے نام و نشان اپنی کوٹھی واقع بالی گنج کلکتہ ۱۹۴۰ء میں انتقال کیا۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۲ء تک راقم کا قیام کلکتہ میں رہا اسوقت تک مٹیا برج میں سلطان خانہ اور امام باڑہ سبطین آباد (جہاں بادشاہ دفن ہیں) باقی تھا

اور متوسلین و لواحقین شاہی کی اولاد میں کچھ لوگ اپنے اپنے مکانوں میں رہتے تھے۔ بازار معمولی تھا لیکن لکھنؤ کی جھلک آتی تھی۔ بعض دوکانوں پر مرحوم سلطان عالم کی تصویریں آویزاں تھیں اور اسوقت تک لکھنؤ کی کچھ مخصوص چیزیں وہاں مل جاتی تھیں۔ بنگال میں تیسری پشت ہونے کے باوجود لوگوں کی زبان بالکل لکھنؤ کی زبان تھی۔ اس کے بعد ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۶ء تک لکھنؤ سے کلکتہ کی آمد و رفت رہی لیکن دن بہ دن مٹیا برج کی حالت ابتر نظر آئی۔ ۱۹۳۶ء میں سلطان عالم مرحوم کی آخری آرامگاہ صرف امام باڑہ دیکھا چند ملازم دیکھ بھال کرتے تھے۔ وہ لوگ جو ہندوستان کے مختلف مقامات سے بغرض تجارت یا سیاحت کلکتہ آتے تھے تاریخی لحاظ سے یا شاہ مرحوم سے عقیدت کے خیال سے روزمرہ آتے رہتے تھے۔ فاتحہ پڑھ کے اور وزیٹرز بک پر دستخط کر کے چلے جاتے تھے۔

سلطان عالم مرحوم کے پوتے پرنس یوسف مرزا بقید حیات ہیں۔ اور سُنا ہے کہ کلکتہ سے کراچی آگئے ہیں۔

مولوی محمد مسیح الدین خان بہادر

سفیر شاہ اودھ بمقام لندن

حوالی لکھنؤ کے تاریخی قصبہ کاکوری کے ایک معزز خاندان کے فرد تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰؓ سے ملتا ہے۔ آپ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرکار میں آگرہ۔ مرشد آباد اور کلکتہ میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ آپ کو ۲ ماہ اگست ۱۸۳۸ء مطابق ۱۱ شہر جمادی الاولیٰ

۱۲۵۴ھ لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل ہند نے حسن خدمت اور کار ہائے نمایاں کے صلہ میں خطاب خانی و بہادری مع سرپیچ جواہر نگار اور مالائے مروارید عطا کیا۔ عرصہ تک خدمات انجام دینے کے بعد سبکدوشی پر عازم وطن ہوئے آپ کو پانچ سال پہلے معلوم ہوگیا تھا کہ برٹش گورنمنٹ کی نیت اودھ لینے کی ہے۔ بوقت انتزاع سلطنت سلطان عالم نے آپکو مشورے کے لئے طلب کیا تھا۔ شاہی قافلہ کی تباہی کے بعد آپ نے عارضی قیام لندن کو ترجیح دی اور دس سال وہیں مقیم رہے۔ آپ کے دیرینہ ملازم میاں قادر بخش بھی ساتھ تھے۔ لندن کے گرانبار اخراجات سے بعض اوقات آپ کو مشکلات کا سامنا ہوا۔ ایک شخص سے چھ ہزار پونڈ اور دوسرے سے پانچ ہزار پونڈ قرض لئے۔ دونوں نے پرونوٹ میں جعل بنایا۔ چھ ہزار پونڈ کے ساٹھ ہزار پونڈ اور پانچ ہزار پونڈ کے پچاس ہزار پونڈ بنا لئے۔ مقدمے چلے اور کسی طرح اس زحمت سے نجات ملی۔

۱۸۶۶ء میں عازم وطن ہوئے۔ مصر پہونچے تو جہاز میں کسی نے ہینڈ بیگ چرالیا جس میں ایک قیمتی گھڑی اور چند بیش قیمت الماس کی انگوٹھیاں تھیں حج کے لئے جدہ میں اترے۔ حج کیا اور مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ سال بھر سے زیادہ ارض پاک میں رہے۔ دوسرا حج کرنے کے بعد مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔ بمبئی سے کانپور پہونچے اور بگھی پر کانپور سے لکھنؤ آئے۔

آگرہ میں آپکی بڑی املاک تھی جو غدر میں تباہ ہوگئی۔ اراضی پر سرکاری عمارتیں تعمیر ہوگئیں۔ لاکھوں کی جائداد ہاتھ سے نکل گئی۔

مرحوم کی دو یادگار چیزیں راقم کے پاس تھیں جو پرنس بہرام علی مرزا نے



دائیں سے بائیں۔ مولوی محمد مسیح الدین خان بہادر۔ نائب۔ ولیعہد کیواں قدر محمد حامد علی بہادر شہزادہ سکندر حشمت محمد جواد علی برادر سلطان عالم۔ انگریز مترجم۔ لندن ۱۸۵۶ء

دیکھنے کے لئے مستعار لی تھیں۔ راقم یہاں چلا آیا اور وہ لکھنؤ میں اُنہیں
کے پاس رہ گئیں۔ ایک ہی حساب تھی جس میں موصوف لندن میں حساب
لکھتے تھے اور ایک نہائت خوش نما جالی تھی جو ایک لیڈی نے آپکو بطور
تحفہ دی تھی۔ اسپر کشیدہ کاری ریشم کے مختلف رنگوں سے ایک گرجا
بنا تھا۔ گرجے کے نیچے انگریزی میں HOPE ON HOPE EVER اور
اس کے نیچے MOLVI MASEEHUDDIN کڑھا ہوا تھا۔
آپ پہلے ہندوستانی تھے جنکو ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرکار سے
یہ خطاب عطا ہوا۔
مولوی صاحب موصوف نے بمقام کاکوری لکھنؤ، محرم الحرام سنہ ١٢٩٩ھ
بعارضہ استسقاء اٹھاسی سال کی عمر میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے
مولوی محمد مسیح الدین خان بہادر کے صاحبزادے مولوی محمد اکرم الدین
خان صاحب ڈپٹی کمشنر بھی حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے
تھے۔ مولوی محمد اکرم الدین صاحب کے بڑے صاحبزادے محمد کلیم الدین صاحب
مرحوم تھے جنکے بڑے فرزند محمد عظیم الدین حیدر سلمہ اور چھوٹے محمد سلیم الدین
سلمہ مشرقی پاکستان میں معزز عہدوں پر فائز ہیں اور بفضلہ صاحب اولاد
ہیں۔ مولوی محمد اکرم الدین صاحب کے چھوٹے صاحبزادے محمد اعظم الدین
عرف آفندی صاحب مرحوم تھے۔ راقم محمد غوث الدین ان کا اکلوتا پسر
ہے اور بے نام ونشان ہے۔

سخاوت اور فیاضی کی چند مثالیں

نواب آصف الدولہ جب شام کو ہوا خوری کو نکلتے تو اہلِ حاجت

درِ دولت پر منتظر رہتے اور ان کے جود و سخا کی بارش سے نہال و نہال ہو جاتے بعض دو دو چار چار گٹھڑیوں تک فارغ البال رہتے۔ نواب فرداً فرداً سب سے مخاطب ہوتے اور ہر ایک کی حاجت روائی فرماتے جاتے ایک دن ایک ضعیفہ نے برقع سے ہاتھ نکال کر ایک تسبیح پیش کی۔ نواب نے لے لی۔ پوچھا یہ کس چیز کی ہے۔ ضعیفہ نے کہا حضور لاکھ کی ہے اُسی وقت ایک لاکھ روپیہ مرحمت فرمایا۔

(۲) ایک عالی نسب مفلوک الحال سیّد کی قدر کرتے ہوئے ایک ہزار روپے درماہہ مقرر کیا۔

(۳) اِسی عہد میں ایک ہندو فقیر ضلع سیتاپور میں ایک سوکھے ہوئے نیب کے درخت کے نیچے آکر بیٹھ گئے جو کئی سال سے خشک تھا خدا کی قدرت سے یہ درخت سرسبز ہو گیا۔ اس واقعہ سے انکی شہرت دُور دُور پھیل گئی۔ عقیدت مند ہزاروں کی تعداد میں آنے لگے۔ مسلمانوں کو بھی اشتیاق ہوا یہاں تک کہ نواب آصف الدولہ مشتاقِ دید ہوئے اور اُن کے مسکن کا قصد کیا۔ مع ہمراہیوں کے پہونچے تو یہ فقیر درخت کے نیچے دھونی رمائے بیٹھے تھے۔ آگ سُلگ رہی تھی جاڑوں کے دن تھے اور ان کے جسم پر صرف ایک چھوٹی لنگی تھی۔ نواب کے ایما سے ایک مقرب نے قیمتی دوشالہ اڑھا دیا۔ انہوں نے دوشالہ اُتار کر آگ میں رکھ دیا۔ نواب کو ناگوار ہوا۔ کچھ کہا نہیں واپس آئے شب کو خواب گاہ میں مسہری کے بائیں وہی دوشالہ رکھا ہوا دیکھا جو فقیر نے آگ میں ڈال دیا تھا۔ دوسرے دن تحقیق سے معلوم ہوا کہ توشہ خانہ میں اس کے جوڑ کی کوئی شال نہیں ہے۔ نواب اس واقعہ سے اتنے متاثر

ہوئے کہ ان کو ایک ہزار گاؤں کی جاگیر عطا کی جس سے لنگر جاری ہو گئے اسی دن سے یہ فقیر بابا ہزارہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ یہ جاگیر ہزارہ اسٹیٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ ایک فقیری گدی تھی جسپر یکے بعد دیگرے چیلوں کا تصرف رہتا ہے اور وہ شادی نہیں کر سکتے۔

(۴) اسی آصفی عہد میں میاں الماس علی خان ایک مشہور رئیس تھے بقضائے الٰہی انکے داروغہ (منیجر) کا انتقال ہو گیا۔ داروغہ کی تحویل میں ان کا ستر بچھتر لاکھ روپیہ تھا جو رئیس مذکور نے اپنی خوشی سے ان کے بیٹے کو دے دیا اور باپ کے عہدے پر تقرر کیا۔

(۵) ایک رئیس زادے محجوب الارث ہو گئے لیکن ان کے چچا نے جائداد میں ان کا حق قائم رکھا تھا۔ عنفوانِ شباب میں صاحب زادے بے راہ روی میں پڑ گئے۔ چچا نے بطور تنبیہ ان کو جائداد سے بے دخل کر دیا اور آبائی مکان سے بھی۔ کہیں سر چھپانے کا ٹھکانا نہ رہا۔ انکے والد کے وقت کا ایک ملازم تھا جسکو انہوں نے برطرف کر دیا تھا چار و ناچار اسکے پاس گئے۔ اس نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور عزت سے اپنے پاس ٹھہرایا۔

صاحبزادے خودکشی کا تہیہ کر چکے تھے۔ دریا پر اسی ارادے سے گئے۔ رات گئے تک واپس نہ آئے۔ وفادار ملازم رات بھر ادھر ادھر ڈھونڈتا پھرا کہیں پتہ نہ چلا۔ درحقیقت یہ دریا میں ڈوبنے گئے تھے اسی ارادے سے غوطہ لگایا مگر جان بہت پیاری ہوتی ہے۔ جب دیر تک پانی کے نیچے رہے دم گھبرانے لگا۔ جی چاہا۔ ابھی ابھر کر پھر سانس لے لیں پانی کی سطح پر آ کر بلا قصد ہاتھ پاؤں چلنے لگے۔ پھر مرنا چاہا۔ پھر غوطہ مارا۔[۱]

[۱] جو شخص تیرنا جانتا ہے وہ اپنے قصد سے نہیں ڈوب سکتا۔ ۱۲

پھر وہی حال ہوا۔ اسی طرح کئی غوطے لگائے مگر ڈوبتے بن نہ پڑا۔ آخر اسی طرح بہتے بہاتے چھتر منزل تک پہونچ گئے۔ اتفاق سے اُسی وقت ولی عہد بہادر مع اپنے مصاحبوں کے بجرے پر سوار ہو کر سیر کو نکلے تھے اُنکی نظر پڑ گئی۔ سمجھے کوئی شخص ڈوب رہا ہے۔ ملاحوں کو حکم دیا جلد نکالو۔ اُنہوں نے چھڑانے کی بہت کوشش کی۔ ملاح اُنکی نیت سمجھ گئے تھے۔ آخر زبردستی کنارے پر لائے۔ ولی عہد بہادر نے اپنے سامنے طلب کیا۔ حال پوچھنے پر معلوم ہوا کہ رئیس زادے ہیں۔ پوشاک مرحمت ہوئی اور ہمراہ کوٹھی میں لے گئے۔

رئیس زادے خوشرو نوجوان۔ ادب قاعدے۔ علمِ مجلسی سے آگاہ اور خواندہ تھے۔ طبیعت میں مذاق بھی تھا۔ غرض ہر طرح شاہزادے کی صحبت کے لائق تھے۔ فوراً مصاحبوں میں اسم ہو گیا۔ بیش قرار مشاہرہ مقرر ہوا۔ اخراجات ضروری کے لئے کچھ پیشگی عطا ہوا۔ نوکر چاکر سواری سب سرکار سے مرحمت ہوا۔ پہلے سے بھی زیادہ شان و شوکت ہو گئی چوک میں نکلے تو جلوس ہی اور تھا۔ ہاتھی پر سوار ہیں۔ پچاس خاص بردار ہمراہ ہیں۔ اس کے بعد چچا سے بھی میل ہو گیا اور اپنی اکلوتی بیٹی کا ان سے عقد کر دیا۔

نواب قُدسیہ محل

شاہ نصیر الدین حیدر کی ایک ملکہ تھیں۔ بادشاہ شاہی رسالہ کا معائنہ کر کے آئے اور آبِ خاصہ طلب کیا۔ کچھ دیر ملکہ سے باتیں کر کے

باہر آئے اور اہل کاروں کو حکم دیا کہ نواب قدسیہ محل کو پشمینہ خانہ دکھایا جائے۔ پہنچم پشمینہ خانہ نے ستر لاکھ روپے کا پشمینہ جس میں توشک لحاف فرش مسند تکیے شال دوشالے وغیرہ تھے پشمینہ خانہ میں سجایا نواب قدسیہ محل دیکھنے آئیں اور آن کی آن میں کل چیزیں اپنی خادماؤں میں تقسیم کر دیں۔ بیگم کی والدہ نے کہا۔ بیٹی ایسی سخاوت کس کام کی کہ انسان اپنا گھر لٹا دے۔ قدسیہ محل نے کہا۔ امی جو کچھ خرچ کروں یا کسی کو دیدوں وہی میرا ہے۔ والدہ نے کہا۔ یہ درست ہے پھر بھی انسان کو سوچ سمجھکر سخاوت کرنا چاہیئے۔ عباسی خانم کہہ رہی تھیں۔ کہ شادی کے موقع پر لاکھ سوا لاکھ روپے کی توشک اور رضائیاں لحاف بنے تھے لیکن دس بیس لحافوں کے علاوہ اور تو مجھکو کچھ نظر نہیں آتا۔ بیگم نے کہا۔ امی یہ چیزیں کس لئے ہوتی ہیں انکی والدہ نے کہا۔ اوڑھنے اور بچھانے کے لئے۔ بیگم نے جواب دیا۔ تو بس پھر انکو کوئی استعمال ہی کرے گا میرے اور آپ کے لئے ایک یا دو لحاف رضائیاں کافی ہیں۔ میرے نزدیک سب سے بہتر یہی ہے کہ خلق خدا کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچاؤں۔ غرباء اور مساکین کو جو کچھ دے سکتی ہوں دیدوں۔ دوسرے ہی دن ایک اور ایسا واقعہ پیش آیا۔ نواب قدسیہ محل نے کسی ضرورت سے خزانہ سے ایک لاکھ روپے کے سو توڑے منگوائے شمار کرنے پر ایک توڑا کم نکلا۔ تلاش کرتے کرتے ایک پیش خدمت کو وہ توڑا پاخانہ میں رکھا ہوا ملا اور اٹھا لائی۔

نواب قدسیہ محل نے کہا۔ یہ توڑا ان توڑوں میں نہ شامل کرنا ورنہ یہ بھی نجس ہو جائینگے۔ اب یہ خاکروب کا حق ہو چکا ہے۔

ایک دن نواب قدسیہ بیگم محلسرا کی چھت پر تھیں اور بہت سی خواصیں

اور پیش خدمتیں انکے گرد بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ سڑک کی سمت سے روشن چوکی اور باجے کی آواز آئی۔ نواب قدسیہ بیگم نے موتی خانم خواص سے کہا دیکھنا تو یہ کیسا باجہ ہے۔ موتی خانم نے دیکھکر کہا۔ حضور برات ہے۔ ایک نوشہ اپنی دُلہن کو رخصت کرا کے لئے جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا۔ دُلہن کو ابھی حاضر کرو۔ چوبداروں نے برات ٹھہرا کر دُلہن کی فینس ڈیوڑھی میں لگوادی اور وہاں سے پیش خدمتیں دُلہن کو گود میں اُٹھا کر نواب قدسیہ محل کے سامنے لائیں۔ انہوں نے اسکا چہرہ دیکھا۔ صورت پسند آئی۔ دُلہن کے جسم پر کوئی زیور نہ تھا۔ نواب قدسیہ محل نے اپنے زیورات کے صندوقچے طلب کئے اور دُلہن کو سر سے پیر تک جواہر نگار زیورات سے لاد کر اپنی خواصوں پیش خدمتوں اور خادماؤں سے کہا۔ رُونمائی دیئے بغیر کوئی دُلہن کا مُنہ نہ دیکھے۔ یہ کہنا تھا کہ کئی سو خادماؤں نے نواب قدسیہ بیگم کی خوشنودی کے لئے حسب حیثیت چاندی سونے کا ایک ایک زیور دیکر دُلہن کا مُنھ دیکھا اور اُسکے گرد زیورات کا انبار لگ گیا۔ تھوڑی دیر میں دُلہن زیورات کے ساتھ رخصت کر دی گئی اور ملکہ اپنی آرام گاہ میں چلی گئیں۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ منّی بیگم خواص نے نواب قدسیہ محل کو اطلاع دی کہ در دولت پر حضور کا قدیم نمک خوار گاما رنگریز حاضر ہوا ہے۔ گاما گاما ہاں وہ بچپن سے میرے کپڑے رنگتا رہا ہے اس سے کہو کہ وہ اب بھی میرے کپڑے رنگا کرے۔ چلمن گرا دو اور اسکو میرے سامنے حاضر کرو۔ منّی بیگم نے چلمن گرا کے دوسری خواصوں کو اشارہ کیا اور گاما خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس نے چلمن کے سامنے پہنچتے ہی آداب شاہانہ کے ساتھ جُھک کر سات سلام کئے۔ اور نگاہ نیچی کر کے کھڑا ہو گیا۔ گاما آج ادھر کیسے آ نکلے

قدسیہ بیگم نے دریافت کیا۔ حضور کو سلام کرنے حاضر ہوا ہوں۔ آپ کا قدیم خدمتگذار ہوں اس لئے ملتجی ہوں کہ نظر کرم رہے۔ ملکہ کے رعب سے اسکی آواز رُکنے لگی۔ کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ حضور آئندہ ماہ میری لڑکی کی شادی ہونے والی ہے۔ کتنا روپیہ درکار ہے۔ علیا حضرت میں کیا عرض کرسکتا ہوں۔ میرے خیال میں پانچسو روپے کافی ہیں۔ گاما جاؤ اور آج سے ہماری ڈیوڑھی پہ نہ آنا۔ نواب قدسیہ محل نے غصہ میں کہا۔ اتنے روپے کے لئے تم کو میرے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی۔ منّی بیگم نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ سرکار گاما ایک غریب آدمی ہے اسکے لئے یہی بڑی رقم ہے۔ آپ کا پرانا نمک خوار ہے۔ گاما نے فوراً ہاتھ جوڑ کر کہا۔ بندہ عفو تقصیر کا خواستگار ہے۔ علیا حضرت میرا ہاتھ آپ کے سامنے ہمیشہ پھیلتا رہے گا اور حضور جو کچھ بھی عطا فرمائینگی میرے لئے کم ہوگا۔ نواب قدسیہ بیگم نے پُروقار لہجہ میں کہا۔ منّی بیگم جاؤ اور گاما کو دس ہزار روپے دلوادو۔ گاما جھک کر آداب شاہی بجالایا۔

بہت دھوم دھام سے لڑکی کی شادی کی۔ از سرِ نو مکان بنوایا اور سرکٹے نالے پر ایک پختہ پل بنوایا جو اتبک موجود ہے اور وہ محلہ پل گاما کے نام سے مشہور ہے۔

نواب قدسیہ محل کی شادی کے ایک سال سات ماہ بعد تولد ولیعہد کی اُمید پیدا ہوئی۔ پانچ ہزار روپے قادر علی خان داروغہ ڈیوڑھی کے ذریعہ روزانہ غرباء میں تقسیم کرائے جاتے رہے۔ گود بھرنے کی تقریب میں ہر طرف انعام واکرام کی بارش ہونے لگی اور شاہ نصیر الدین حیدر کے حکم سے توڑوں کے منہہ کھولدیئے گئے۔ مسکینوں اور غریبوں نے سال دو

میاں کے لئے اپنے کھانے کا انتظام کر لیا۔ ایوانات شاہی کے ملازمین نے صرف ایک تقریب میں عمارتیں کھڑی کر لیں۔ قضا کار حمل ساقط ہو گیا۔ ملکہ کی جان کے لالے پڑ گئے۔ بڑی تگ و دو کے بعد خدا نے دوسری زندگی بخشی۔ پانچہزار روپیہ خیرات کیا گیا اور دھنیا نہری نے ایک طشت نقرئی جواہرات سے بھرا ہوا نواب قدسیہ محل پر سے اُتار کر خواصوں اور پیش خدمتوں میں لُٹا دیا۔ اور جہاں پناہ نے دھنیا نہری کے ایما سے غسلِ صحت کے جشن کی تیاری کا حکم دیا۔

بادشاہ نے ملکہ کے لئے ایک کشمیری زرگر سے نئی وضع کے مرصع زیورات بنوائے اور شاہی درزیوں کے جمعدار رمکا کو حکم دیا کہ ملکہ عالیہ کے لئے ایک نایاب اور بے مثل جوڑا تیار کیا جائے۔ غسلِ صحت کی تقریب کے روز رمکا درزی جوڑے کو ایک گنگا جمنی کشتی میں سجا کر روشن چوکی کے ساتھ درِ دولت پر پہنچا۔ جوڑے میں گران بہا یاقوت اور گوہر آبدار ٹنکے ہوئے تھے۔ جوڑا بہت پسند کیا گیا اور رمکا انعام لے کر رخصت ہوا۔

نواب قدسیہ محل نے غسل کے بعد جوڑا زیب تن کیا۔ دھنیا نہری پاس کھڑی تھی بلائیں لے کر کہنے لگی۔ سرکار نیا جوڑا مبارک ہو حق تعالیٰ حضور کا مرتبہ اور بلند کرے اور وہ دن آئے کہ ایسے ایسے جوڑے آپ ہم غریبوں کو تقسیم کریں۔ نواب قدسیہ محل نے مسکرا کر دھنیا نہری کی طرف دیکھا اور دوسرا جوڑا پہن کر وہ جوڑا اُسی وقت اس کو دے دیا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ میرا یہ منشا نہ تھا کہ حضور عالیہ یہ جوڑا مجھکو مرحمت فرمادیں بلکہ حضور کو پہنے دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

حضور اسے زیب تن فرمائیں ورنہ جہاں پناہ ناخوش ہوں گے ابھی انہوں نے حضور کو یہ پوشاک پہنے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ خانم نواب قدسیہ محل نے سر پر دوپٹے کا آنچل ڈالتے ہوئے کہا۔ یہ جوڑا تم اسی وقت پہنو۔ سرکار اس قدر قیمتی پوشاک جہاں پناہ کے حکم کے بغیر کیسے پہن سکتی ہوں۔ خانم تم کو میرے سر کی قسم۔ نواب قدسیہ بیگم نے دھنیا مہری سے کہا۔ تم اسی وقت اس جوڑے کو پہن کر جہاں پناہ کو دربار میں سلام کرو۔ دھنیا مہری نے دونوں ہاتھ ٹکا کر کہا۔ لو اور سنو۔ سرکار آپ تو ستم پر ستم کرتی ہیں۔ جہاں پناہ مجھکو یہ جوڑا پہنے دیکھکر بھلا زندہ چھوڑیں گے۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ میری ناک چوٹی کاٹی جائے اور گدھے پر سوار کرا کے شہر میں ہنڈوائی جاؤں۔ نواب قدسیہ محل نے کہا۔ بلا سے۔ مگر تم کو میری خوشی کرنا ہوگی۔

دھنیا مہری نے اسی وقت جوڑا پہنا اور بادشاہ کے حضور پہنچکر سلام کیا۔

تھوڑی دیر میں شاہ جہجاہ نواب قدسیہ محل کے پاس آئے اور کہا۔ میں نے تم کو ایک دفعہ بھی وہ جوڑا پہنے نہیں دیکھا اور تم نے خانم کو دے دیا۔ نواب قدسیہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔ خدا آپکو سلامت رکھے۔ معلوم نہیں ایسے ایسے کتنے جوڑے پہن لوں گی۔ سچ تو یہ ہے۔ پہننے سے دینے کا نام زیادہ ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں مشہور ہو جائے گا کہ شاہ دہلی نے ایک لاکھ کا جوڑا اپنی ملکہ کے لئے بنوایا اور شاہ اودھ نے ایک لاکھ کا جوڑا اپنی مہری کو دے دیا۔

بادشاہ خوش ہو گئے اور کہا واللہ تم صحیح معنوں میں ملکۂ اودھ ہو۔ تمہاری اس دربادلی سے میرا دل خوش ہو گیا۔

افضل النساء خانم

دھنیا مہری

علاوہ دیگر زنانے عملہ کے شاہی محلات میں مسلمان کہاروں کی عورتیں ملازم ہوتی تھیں جو مہریاں کہلاتی تھیں۔ ان کے متعلق مختلف خدمات ہوتی تھیں۔ یہ ملازمت زیادہ تر آبائی ہوتی تھی اور ان کو ابتدائے عمر سے ادب قاعدے اور آداب محفل کی تربیت دی جاتی تھی۔ ان میں بعض کو حسن خدمت کے صلہ میں ترقی دے کر محل کے انتظام میں شریکِ کار بنا لیا جاتا تھا۔ اسی طرح کی ایک ترقی یافتہ مہری بادشاہ غازی الدین حیدر کی محلسرا میں تھی۔ اسکی لڑکی دھنیا مہری حسن وجمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی نہایت ذہین اور سمجھدار ہونے کے ساتھ اس میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں جسکی وجہ سے اس نے محل میں بڑی اہم پوزیشن حاصل کر لی تھی مشہور ہے کہ شاہ غازی الدین حیدر کے زمانہ میں جب اس کا عہدِ شباب آیا تو خوبصورت ولی عہد کا بھی عالم شباب تھا اور بہ تقاضائے سِن اس سے مالوف ہو گئے تھے۔

تخت نشین ہونے کے بعد نصیر الدین حیدر نے اسکو افضل النساء خانم کے خطاب سے سرفراز کیا اور محلسرا کا ناظر بنا دیا۔ بہرحال عروج کی اصلیت جو بھی ہو یہ بے اندازہ زر وجواہر سے مالا مال تھی مدت العمر

امیرانہ زندگی بسر کی نہائت قیمتی ملبوسات زیب تن کرتی تھی اور پانچ اشرفیوں کے پاپوش سجاتی تھی موتیوں کے ہار یاقوت اور زمرد کے کنٹھوں الماسی کرن پھول سے مزین رہتی تھی۔ اسکی اسی حالت کی ایک قلمی تصویر لکھنؤ کے عجائب گھر میں ہے۔

اسکے پاس ایک غریب آدمی آیا اور کہنے لگا کہ میں نے کبھی ایک لاکھ روپیہ نہیں دیکھا ہے مجھے دکھا دیجئے۔ اس عالی حوصلہ خانم نے ایک لاکھ روپیہ برآمد کرا کے اسکا چبوترہ بنوایا اور اس شخص کو اسپر بٹھا دیا اور جب وہ جانے لگا تو وہ لاکھ روپیہ بھی اسے دے دیا۔ اس کا محل اور امام باڑہ تو اب باقی نہیں ہے۔ اسکی بنوائی ہوئی مسجد مولوی گنج لکھنؤ میں ابتک موجود ہے جو مسجد دھنیا مہری کے نام سے مشہور ہے۔ مسجد کے میناروں پر سونا چڑھا ہوا ہے۔ اس کا بنوایا ہوا پل بھی ہے اور اسی کے نام سے مشہور ہے۔

---

(۱) نور بخش اور ظہور بخش یہ دونوں بھائی شاہ نصیر الدین کے ملبوسات تیار کرتے تھے انکی شان و شوکت محلات اور اولوالعزمیاں بڑے بڑے امراء سے چشمک زنی کرتی تھیں۔ بادشاہ گرمیوں میں جو لباس زیب تن فرماتے تھے وہ ایک ہزار میں تیار ہوتا تھا۔ ہر صبح کا تبدیل کیا ہوا لباس شام کو باری باری ملازمین کو دے دیا جاتا تھا۔ جاڑوں کی پوشاک ایک لاکھ میں تیار ہوتی تھی جسے بادشاہ اگلے سال جاڑوں میں نہیں پہنتے تھے۔

یہی زمانہ تھا کہ باہر سے ایک عطر ساز لکھنؤ آیا اور اس نیت سے آیا کہ بادشاہ کے حضور باریاب ہو کر عطر کے نمونے پیش کرے جو پہنے

اسی تگ و دو میں رہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ایک دن بڑی حسرت و یاس سے ایک واقف کار سے اپنا مقصد بیان کیا اور کہا کہ یہاں بہت کچھ امیدیں لے کر آیا تھا باریابی کی کوشش کرتے کرتے تھک گیا اب بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ بے نیل مرام اپنے گھر واپس جاؤں۔ اُس شخص نے کہا کہ براہِ راست بادشاہ تک رسائی ناممکن ہے۔ نور بخش یا ظہور بخش سے ملئے وہ آپ کو بارگاہِ سلطانی تک پیش کر دیں گے۔ چنانچہ عطر ساز نور بخش کی محلسرا پہنچا۔ دیکھا تو کیا ٹھاٹ پر پہرہ تھا۔ دربان سے مدعا بیان کیا۔ دیر کے بعد طلبی ہوئی۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ تختوں کے چوکے پر صاف شفاف فرش بچھا ہوا تھا۔ نور بخش مخملی مسند اور گاؤ تکیہ پر رونق افروز تھے۔ سامنے پیچوان لگا ہوا تھا۔ پنکھا جھلا جا رہا تھا۔ صحن کیوڑے اور گلاب کی خوشبو سے معطر ہو رہا تھا۔ عطر ساز نے بہ ادب سلام کیا اور اشارہ پا کر ادب سے بیٹھ گیا۔ عطروں کے نمونے پیش کئے۔ نور بخش نے پوچھا۔ کتنے کا عطر لائے ہو۔ عطر ساز نے جواب دیا۔ پچاس ہزار کا اُسی وقت قیمت ادا کر دی اور کہا۔ کہ یہ عطر جب ہمیں پسند نہ آئے تو ظلِ سبحانی عالم پناہ کو کب پسند آئیں گے۔ اتنی دُور سے آئے ہو تمہیں خالی ہاتھ کیا واپس کریں عطر ساز کو حیرت ہوگئی۔ خاندانی عطر ساز تھا اور بڑی جانفشانی سے عطر تیار کر کے لایا تھا۔

نور بخش ظہور بخش کے محل کی جگہ اب انگریزی عہد کا ایک گرجا ہے جو انہیں دونوں کے نام سے مشہور ہے۔ مختصر سا حصہ باقی ہے جو مختلف لوگوں کی ملکیت ہے۔ اب بھی اُنکی سر بفلک دیواریں ماضی کی نشاندہی کرتی ہیں۔

مکّا درزی کے اہتمام میں شاہ نصیر الدین حیدر کی بیگمات کے ملبوسات

تیار ہوتے تھے۔ اُس نے لاکھوں رُوپے کی عمارتیں بنوائیں۔ وہ عمارتیں تو اب نہیں ہیں۔ اس کے باغ کے مقام پر ہندو مہاجنوں کا محلہ آباد ہے جو اب تک مکا کے باغ کے نام سے مشہور ہے۔

۱۸۳۷ء میں محمد علی شاہ جب تخت نشین ہوئے تو قبض شاہی کے کل ملبوسات ایک دیرینہ مُحب صادق کو دے دیئے جو بلا ناغہ حاضر باشی میں رہتے تھے۔ ایک دن بادشاہ نے ان سے کہا۔ بہت دن ہو گئے ہم نے تمہارے لڑکے کو نہیں دیکھا کسی دن ساتھ لیتے آؤ۔ اُن صاحب نے عرض کیا حضور جانتے ہیں وہ فاطر العقل ہے خدانخواستہ اُس سے کوئی بے ادبی ہو گئی تو مجھے بہت رنج ہوگا۔ بادشاہ نے کہا۔ ایسا ہوا بھی تو میں بُرا نہیں مانوں گا اُن حضرت نے لڑکے کو آداب شاہی مُجرے اور نذر پیش کرنے کے طریقے اچھی طرح یاد کرائے۔ چلتے وقت پھر سمجھایا۔ دیکھو خبردار بادشاہ کے سامنے چپ رہے ہو کوئی بے ادبی نہ ہونے پائے۔ لڑکے کو لیکر بادشاہ کے حضور پہونچے تو بادشاہ خوش ہو گئے لڑکے نے حسب ہدایت آداب شاہانہ ادا کئے۔ ہتھیلی پر اشرفیاں رکھکر نذر پیش کی۔ بادشاہ کے قریب ہاتھ جاتے ہی لڑکے نے باپ کی طرف دیکھا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ بادشاہ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ چلتے وقت لڑکے کو سوا لاکھ رُوپیہ مٹھائی کے نام سے دیا۔

انہیں کے عہد میں ایک سال لکھنؤ میں ہیضہ کی بڑی وبا پھیلی ایک اعلیٰ منصب دار اس کا شکار ہو گئے اور تین لڑکے چھوڑ گئے۔ بادشاہ نے بڑے لڑکے کو بلوایا تسلی و تشفی دی اور متوفی کا ڈھائی ہزار روپیہ ماہانہ تا بلوغ جاری رکھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ جان عالم واجد علی شاہ نماز صبح کے بعد سیر کرنے

ہوئے موتی محل کے پاس آنکلے کوئی ساتھ نہ تھا۔ دیکھا کہ ایک سپاہی بے خبر سو رہا ہے۔ جی میں آیا اُسے جگا دیا۔ سپاہی گھبرا کے آنکھیں ملتا ہوا بیدار ہوا۔ سامنے عالم پناہ کو دیکھا اور بھی گھبرا گیا۔ کچھ پاس نہ تھا جلدی سے تلوار نذر کی۔ جان عالم نے نذر قبول کی اور تلوار کی تعریف کی۔ اپنی طلائی قبضہ کی مع کمر جواہر نگار اس کو دے دی۔ اسی اثناء میں مصاحب خاص بردار چوبدار وغیرہ آگئے۔ ان سے اس نوجوان سپاہی اور اس کی تلوار کی تعریف کی۔ اپنا ملبوس خاص موتیوں کا ہار اور مرصع نورتن بھی عطا کر دیئے خود دوسرا لباس زیب تن فرمایا۔ سپاہی کی صورت ہی کچھ اور ہو گئی۔ اُس کا کسی پلٹن میں اِسم تھا۔ آپ رات کو گھر سے خفا ہو کے نکلے رات بھر اِدھر اُدھر پھرتے رہے صبح ہوتے تھک کے موتی محل کے پاس بیٹھ گئے نیند کا غلبہ ہوا سو گئے صبح کو بخت بیدار نے جگا دیا اور دم بھر میں غریب سے امیر بنا دیا۔

شاہی میں لوگوں کی زندگی میں ایسے انقلاب اکثر ہوا کرتے تھے۔ غریبوں کی حالت میں دفعتاً تغیر ہو جاتا تھا۔

سلطان عالم ہر سال قیصر باغ میں جوگیہ میلہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ تین دن کے میلہ میں اسّی ہزار وابستگان دولت کو انعام خوش گوار عطا ہوا۔

انقلابات زمانہ سے فرمانروایان اودھ کی کامل خود مختاری نذر ہو گئی لیکن جبتک یہاں صرف اندرونی خود مختاری کا چراغ جھلملاتا رہا اس وقت تک ہر طرف اطمینان اور خوشحالی کا دور دورہ تھا جو انگریزی عہد میں کبھی نصیب نہ ہو سکا۔ اودھ میں شائد ہی کوئی ایسا گھر ہو گا جہاں

گنی گنی سیر چاندی اور کچھ سونا نہ ہو۔

سنہ ۱۸۵۷ء

انگریزوں کے خلاف بغاوت کی ابتدا انگریزی فوج کے ان سپاہیوں نے کی جو اودھ کے باشندے تھے۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت قوت کے بل پر چل رہی تھی۔ اس قوم نے کبھی اپنے عہد و پیمان کا پاس نہیں کیا۔ جس وقت جیسی مصلحت دیکھی اسی پر عمل کیا۔ دھوکہ، مکر و فریب وعدوں سے انحراف انکے لئے سب روا تھا جسے بے بس ہندوستانی برداشت کرتے رہے۔ ریاستوں کے عوام خوش حال تھے۔ ڈلہوزی نے عہدناموں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ریاستوں کے الحاق کا سلسلہ شروع کیا۔ لاولد فرمانروا کو متبنّیٰ کرنے کے حق سے محروم کر دیا اور ایسی ریاستیں انگریزی قلمرو میں شامل ہونے لگیں۔ ایسا قانون ہندو مسلمانوں کے مذہب کی توہین بھی تھا۔

پہلے ستارہ۔ ناگپور۔ جھانسی کی ہندو ریاستیں ضبط کر لی گئیں اور متوفی راجاوں کا بہت کچھ ذاتی سامان اور ہاتھی گھوڑے تک نیلام کر دیئے گئے۔

معزول پیشوا جو سنہ ۱۸۲۱ء سے بٹھور کان پور میں مقیم تھے سنہ ۱۸۵۱ء میں لاولد مر گئے۔ ان کا آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ موقوف کر دیا گیا۔ اور ان کے متبنّیٰ ناناصاحب کو ڈلہوزی نے لکھا کہ آپ متوفی پیشوا کے حقیقی بیٹے نہیں ہیں اس لئے وظیفہ کے حقدار نہیں۔ پیشوا کی کثیر

دولت آپ کے لئے کافی ہے - نانا صاحب نے اپنا مقدمہ ایک مسلمان وکیل کی معرفت لندن بھیجا وہاں بھی ناکامی ہوئی -

نانا صاحب فہیم، خوش اخلاق اور ہر دل عزیز تھے۔ اگرچہ سلطنت نہ رہی تھی لیکن لوگوں میں ان کا شاہانہ احترام اور اقتدار باقی تھا۔

اخیر میں ہندوستان کی سب سے بڑی اور اہم قلمرو اودھ پر قبضہ کر لیا گیا۔

۱۸۵۳ء میں فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا -

مشنریاں تیزی سے تبلیغ کر کے لوگوں کو عیسائی بنا رہی تھیں -

۱۸۵۷ء میں کلکتہ مشن سے ہندوستانی سرکاری حکام کو خطوط بھیجے گئے جسکا مطلب یہ تھا کہ اب پورے ہندوستان میں ایک حکومت ہے اس لئے مذہب بھی ایک ہونا چاہئیے مناسب ہے کہ آپ عیسائی ہو جائیں۔ ان خطوط سے لوگوں میں اضطراب پیدا ہوا اور یقین کرنے لگے کہ یہ خطوط حکومت کے ایما سے بھیجے گئے ہیں اب سب ہی کو عیسائی ہونا پڑیگا ہندوستانی سپاہی انگریزوں کی بدسلوکی سے بیزار تھے۔ اسی اثناء میں کارتوس کا قضیہ کھڑا ہو گیا جن کا کاغذ دانتوں سے پھاڑ کر بندوق میں بھرنا ہوتا تھا ہندوستانی سپاہیوں کو یقین ہو گیا کہ کارتوسوں کے کاغذ کو گائے اور سور کی چربی سے چکنا کیا گیا ہے اور یہ بے دین کرنے کی دوسری چال ہے انہیں حالات نے ہمالیہ سے لیکر بندھیاچل تک بغاوت کی آگ لگا دی اور انگریزی ایوانِ حکومت کو لرزا دیا۔

اس عظیم مقصد میں ناکامی کا سب سے بڑا سبب قومی غداری تھی جو ہندوستان کی تاریخ ہمیشہ دہراتی رہی ہے -

اس جنگ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ہندو مسلم اتحاد کے جو بےدرح پرور نظارے اس وقت دیکھے گئے اس سے پہلے اور اس کے بعد پھر کبھی دیکھنے میں نہ آئے اور نہ آئندہ امید ہے۔ دونوں قوموں کے لاکھوں افراد نے شانہ بہ شانہ انگریزوں سے جنگ کی اور مادر وطن کی آزادی کے لئے پروانہ وار نثار ہوگئے۔

۱۷ مارچ ۱۸۵۷ء کو بغاوت کی ابتدا بارک پور کی انگریزی چھاؤنی سے ہوئی جو کلکتہ سے بیس میل ہے۔ ایک کنوئیں پر ہندوستانی سپاہی جمع ہوئے منگل پانڈے نے جو اودھ کے باشندے تھے کنوئیں کی جگت پر کھڑے ہو کر سپاہیوں سے خطاب کیا اپنے ملک کی ضبطی بادشاہ پر ظلم ان کے عہد کی خوشحالی۔ ستارہ۔ ناگپور۔ جھانسی کی ضبطی۔ عیسائی بنانے اور کارتوس کے کاغذ کا ذکر کیا اور جانوں کی قربانی پیش کرنے کی تلقین کی۔

ان سب نے پہلے پریڈ کے موقع پر عدول حکمی کی پھر چھاؤنی لوٹنے میگزین اور بارکوں کو آگ لگانے کے بعد انگریزوں سے برسر پیکار ہوگئے۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی چھاؤنی میں بغاوت ہوئی اور ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی کے قلعہ میں ہندو مسلمانوں نے بالاتفاق بہادر شاہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا۔

سات مہینے میں دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ بہادر شاہ نے ہمایوں کے مقبرہ میں پناہ لی۔ وہاں سے میجر ہڈسن نے گرفتار کیا قید ہوگئے دوسرے دن مقبرہ سے دونوں شہزادے گرفتار کر کے قتل ہوئے ہڈسن نے ان کا خون پیا اور شہزادوں کے سروں کو کشتی میں رکھ کر بہادر شاہ کو تحفہ بھیجا۔ اس سلسلہ میں بہادر شاہ کے طبیب حکیم احسان اللہ خاں نے جو

خدمات انجام دیں اس کے صلہ میں انگریزی سرکار سے ان کو سیتاپور اودھ میں ایک علاقہ ملا۔ یہ وہیں کے تھے۔

۶ جون ۱۸۵۷ء کو رانی لکشمی بائی والیہ جھانسی نے انگریزی فوج پر حملہ کیا۔ چھ شبانہ روز کی جنگ میں انگریزوں کو شکست ہوئی اور محصور ہو گئے۔ بہت سے مارے گئے۔ انکی عورتیں اور بچے جو رانی کی پناہ میں آرہے تھے۔ راستہ میں رانی کی لاعلمی میں باغیوں نے ان کو قتل کر دیا۔

سدا شیو راؤ جو کبھی جھانسی کے تخت کا دعویدار تھا انگریزوں سے مل گیا۔ قلعہ کے پھاٹک کے محافظ کو بھاری رشوت دے کر پھاٹک کھلوا دیا۔ انگریز اندر داخل ہو گئے۔ قلعہ کو آگ لگا دی۔ رانی کے جنرل غلام غوث لڑتے ہوئے ہلاک ہو گئے۔ اس سے رانی مایوس ہو گئیں اس دن جھانسی میں تمام دن آگ لگی رہی۔ جنرل ہیوروز نے سدا شیو راؤ کو توپ دم کر دیا۔ رانی اپنے متبنیٰ بیٹے اور رفقار کو لے کر کالپی چلی گئیں۔ اور نانا صاحب کی فوجوں سے جا ملیں۔ گوالیار فتح کیا۔ انگریزوں نے حملہ کیا جسے رانی نے پسپا کر دیا۔ انگریزوں نے دوبارہ حملہ کیا۔ رانی نے اپنی مختصر فوج سے مردانہ وار مقابلہ کیا اور انگریزوں سے دست بدست لڑتی ہوئی اتنی زخمی ہو گئیں کہ موت سامنے نظر آنے لگی۔ اسی حالت میں اُنکے وفادار گھوڑے نے ان کو ان کے بچپن کے رفیق شنکر کی کوٹی پر پہنچا دیا جس نے فقیری لے لی تھی۔ تھوڑی دیر میں رانی کی روح پرواز کر گئی تاریخ انتقال ۱۸ جون ۱۸۵۷ء ہے۔

نانا صاحب تیرتھ کے بہانے گھر سے نکلے اور بھیس بدل کر بہت سی انگریزی

چھاؤنیوں میں ہندوستانی سپاہ سے ملے اور ان کو جنگ کے لئے آمادہ کیا لیکن کسی انگریز کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ جب تیاری مکمل ہو گئی تو کان پور کے کمانڈر کو لڑنے کے لئے تیار ہونے کی اطلاع کی۔ میڈوز اور ہگ روز کی افواج کو نانا صاحب نے شکست دی۔ کان پور پر قبضہ کر لیا اور دہلی کا شاہی پرچم لہرایا۔ انگریز نانا صاحب سے ملتجی ہوئے کہ انکی عورتوں اور بچوں کو براہ گنگا الہ آباد جانے دیا جائے۔ نانا صاحب نے منظور کر لیا اور ساتھ ہی تاکید کی کہ روانگی پوشیدہ طریقہ پر رات کو ہو دن کو ہوئی تو وہ ذمہ دار نہ ہوں گے کیونکہ ہر طرف لوگ انگریزوں کے دشمن ہیں۔ اس تاکید پر بھی روانگی دن کو ہوئی۔ عورتیں اور بچے کشتیوں پر سوار ہوئے ہندوستانیوں نے دیکھ لیا اور گولیوں کی بوچھاڑ کر دی بہت سی عورتیں اور بچے مارے گئے۔ کمپنی باغ کان پور میں ایک بڑا کنواں انگریزوں کی لاشوں سے پٹ گیا تھا جسے قبر میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے چار کونوں پر سنگ مرمر کے مجسمے فرشتوں کے نصب ہیں۔ باغ کے صدر دروازہ کے ستونوں پر سنگ مرمر کے تختے نصب تھے جن پر اردو اور انگریزی میں یہ الفاظ کندہ تھے "کتوں اور ہندوستانیوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں"

کان پور پر انگریزی قبضہ ہو جانے کے بعد جنرل نیل نے "نیلی جھنڈر فوج" بنائی ان جھتروں کے سپرد یہ کام تھا کہ جس پر ذرا بھی شبہ ہو اسے بلا تحقیق پکڑ لائیں جب ایسے لوگ لائے جاتے تو ہندوؤں کے چہروں پر گائے کی چربی اور مسلمانوں کے چہروں پر سور کی چربی لگائی جاتی۔ اس کے بعد ان کو ایک خون آلودہ فرش کے کمرہ میں لے جاتے جو انگریزوں کا خون تھا اس خون کو زبان سے چاٹنے کا حکم ہوتا چاٹتے وقت ایک جھنڈر چمڑے کا تلہ سر پر مارتا جاتا پھر اس شخص کو قتل کر دیا جاتا نانا صاحب کی اکلوتی بیٹی مینا بائی کو کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا گیا۔ اس کے

تڑپ کر مرنے پر انگریز خوش ہوئے اور تالیاں بجائیں۔
ناناصاحب کے محل لوٹ کر مسمار کر دیئے گئے۔ ان کی کوئی نشانی باقی نہیں رکھی گئی۔
ناناصاحب اناؤ کے ایک مسلمان زمیندار کے یہاں دو مہینے روپوش رہے۔ ان کا گھوڑا زینہ پر چڑھ جاتا تھا۔ انگریزوں کی طرف سے ان کی بہت تلاش ہوئی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔
بہادر شاہ نے ۱۸۶۲ء میں رنگون میں انتقال کیا۔ معمولی قبر تھی۔ عرصہ ہوا ایک تاجر نے مقبرہ بنوا دیا۔
بہادر شاہ کے بعد تین سو روپے کا وظیفہ موقوف ہو گیا۔ ان کی بیگم زینت محل نے بڑی عسرت سے زندگی کے دن پورے کئے۔ سلائی پر بسر تھی اخیر عمر میں آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی تھی۔
بادشاہ کے ایک پوتے دادا کی قبر کی مجاوری کرتے تھے جو کچھ چڑھتا تھا اس پر ان کی گزر بسر تھی۔

لکھنؤ ۱۸۵۷ء میں

لکھنؤ اور اودھ کے عوام معیشت کے مصائب میں مبتلا ہو گئے تھے شاہی نظام درہم برہم ہو گیا۔ سب محکمے اور دفاتر توڑ دیئے گئے۔ نوکریاں ختم کر دی گئیں۔ وہ جو آسودہ حال تھے اور دونوں وقت پیٹ بھر کے کھاتے تھے روٹیوں کو محتاج ہو گئے۔ فرمانروایان اودھ باشندگان اودھ کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ سلطانِ عالم کے

وفاداروں میں ایسے سرفروش بھی تھے جو پیٹ پر پتھر باندھ کر میدان میں مقابلہ کے لئے نکل آتے۔ اوسط درجہ کی منتظم فوج بھی تھی جس پر آسانی سے انگریز غلبہ نہیں پا سکتے تھے لیکن سلطان عالم کے خاموشی سے دست بردار ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وزیر اعظم علی نقی خان کے ایسے غدار بھی بہت تھے جنکی سازش سے انگریزی فوجیں گنگا پار اتر وا دی گئی تھیں اور جنگ کی حالت میں یہی نقشہ سلطان عالم کے پیش نظر تھا۔

ایام غدر میں انگریزوں کے خلاف جتنا غم و غصہ لکھنؤ اور اودھ میں تھا اور جتنے سخت اور خون آشام معرکے یہاں ہوئے ہندوستان میں اور کہیں نہیں ہوئے۔ لکھنؤ اس جنگ کا سب سے بڑا اور اہم مرکز تھا اور یہیں اخیر تک لڑائیاں لڑی گئیں۔ یہاں اخیر مئی ۱۸۵۷ء میں جنگ کا آغاز ہوا اور مضافات لکھنؤ میں جولائی ۱۸۵۸ء تک محبان وطن لڑتے رہے۔ تمام شاہی افواج کے سپاہی اور افسر باغیوں میں شامل ہو گئے اور ظفر مبارک پلٹن کے رسالہ دار کپتان فدا حسین خان نے نمایاں کردار ادا کیا۔

بعد الحاق اودھ سلطان عالم کو معزول کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا۔ تعلقداران اودھ کو انکے علاقوں میں خود مختاری کے حقوق سے محروم کر دیا گیا۔

۱۸۵۷ء کے آغاز میں انگریزوں کو دہشت اثر خبریں پہنچنے لگیں لکھنؤ کے شاہی خاندان اور امراء سے اسلحہ ضبط کرنے کا حکم ہوا۔ یہاں مہینوں سے محبان وطن غور و خوض میں مصروف تھے۔ آخرکار سب سے پہلے آغا مرزا اشرف کمبل پوش نے دو سو جاں نثاروں کے

ساتھ محمدی جھنڈا بلند کیا۔ چیف کمشنر اودھ نے ان سب کو گرفتار کروا دیا۔ کمبل پوش اور ان کے چودہ ساتھیوں کو پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد مولوی احمد اللہ شاہ جو ٹیپو سلطان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے وارد لکھنؤ ہوئے اور گھسیاری منڈی میں قیام کیا۔ لوگ جوق در جوق ان کے گرد جمع ہو گئے۔ پالکی میں نکلتے تو آگے ڈنکا بجتا جاتا۔ انہوں نے اپریل ۱۸۵۷ء میں باغیانہ پرچے تمام اودھ میں تقسیم کروائے جسے دیکھ کر انگریز بہت پریشان ہوئے۔ مولوی صاحب کی گرفتاری کا حکم ہوا۔ پولیس ناکام ہوئی تو فوج نے گرفتار کیا۔ عدالت سے پھانسی کا حکم ہوا۔ پھانسی نہ ہونے پائی تھی کہ اودھ میں جنگ آزادی شروع ہو گئی جہنم قید خانہ نے ان کو رہا کر دیا۔

باشندگان اودھ نے اضلاع فیض آباد۔ نواب گنج بارہ بنکی۔ سیتاپور۔ لکھیم پور کھیری۔ گونڈہ۔ بہرائچ۔ رائے بریلی پرتاب گڑھ سندیلہ۔ سلطان پور۔ اور اناؤ میں مضبوط مورچے قائم کر لئے تھے۔ بنگال کی ہندوستانی فوج میں زیادہ تر اودھ کے باشندے تھے بارک پور وغیرہ میں جب ان لوگوں نے بغاوت کی تو ان کے رہنماؤں کو پھانسیاں دے دی گئیں اور سب سپاہیوں سے اسلحہ لے کر ان کو برخاست کر دیا گیا یہ سب واپس آ کر اودھ کے اضلاع میں پھیل گئے اور بڑی تعداد میں لکھنؤ آ گئے۔

لکھنؤ میں ۳۰ مئی ۱۸۵۷ء کو ہندوستانیوں نے انگریزی فوج پر باقاعدہ حملہ کر دیا۔ انگریزوں نے شہر اور چھاؤنی خالی کر کے بیلی گارڈ (رزیڈنسی) میں پناہ لی جو جنرل اوٹرم چیف کمشنر کی قیام گاہ تھی۔ انگریز محصور ہو گئے

ایک ہزار آٹھ گورے سات سو بارہ ہندوستانی سپاہی چھ سو عورتیں اور بچے تھے چھ سو اسّی ہندوستانی ملازم تھے۔ ۳۰ جنوری ۱۸۵۷ء کو بیلی گارد کو کئی لاکھ ہندوستانیوں نے گھیر لیا۔ گولہ باری کے ساتھ ایسے شدید حملے کئے کہ وسیع و عریض عمارات کے پرخچے اڑ گئے ایک چھت سلامت نہ رہی دیواریں چھلنی ہو گئیں۔ بہت انگریز مارے گئے۔ ایک گولہ پھٹنے سے سر ہنری لارنس ہلاک ہوئے۔ انگریزوں کے پاس خوراک و سامانِ جنگ ختم ہو گیا۔ رزیڈنسی بیلی گارد کے تہہ خانہ میں جو انگریز عورتیں اور بچے مارے گئے ان کے خون کے دھبے دیواروں پر قبل تقسیم تک تھے جو مدھم ہو گئے تھے۔

۱۲ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۵ جولائی ۱۸۵۷ء لکھنؤ کے لئے ایک تاریخی دن تھا۔ دن بھر ابر کے ٹکڑے آسمان پر منڈلاتے رہے۔ زوالِ آفتاب کے بعد ایک چھینٹا پڑا اور مغرب سے قبل لال بارہ دری میں سلطان عالم واجد علی شاہ کے چوتھے شہزادہ مرزا برجیس قدر کی تاج پوشی عمل میں آئی اور ان کے نام کا سکہ جاری ہوا۔ والدہ نواب حضرت محل نائب السلطنت مقرر ہوئیں کہ شہزادہ کی عمر اس وقت چودہ سال تھی (بحوالہ مثنوی سلطان عالم) گیارہ دن کے مختصر عرصہ میں اودھ کے کسی ضلع میں انگریزی حکومت کی طرف سے کوئی حاکم نہ تھا اور انگریزی عملداری خواب معلوم ہوتی تھی سب اضلاع انگریزوں کے قبضہ سے نکل گئے تھے۔ حضرت محل نے متصل قیصر باغ شاہی کوٹھی چولکھی میں سکونت اختیار کی وہیں دربار لگتا تھا اور حکم احکام جاری ہوتے تھے۔ حضرت محل حکومت کا انتظام خود کرتی

تھیں اور جنگی منصوبے تیار کرتی تھیں۔ خود گھوڑے پر سوار ہو کر فوج کے آگے ہوتی تھیں اور سپاہیوں کے حوصلے بڑھاتی تھیں۔ حملوں کے دوران وہ تمام رات انتظام میں مصروف رہتی تھیں اور ایک لمحہ نہ سوتی تھیں۔ ان کے جوش اور مستعدی کے بڑے چرچے تھے اور اودھ کے چپہ چپہ میں لوگ انگریزوں کو نیست و نابود کرنے پر تل گئے تھے۔ حضرت محل نے تعلقداروں اور زمینداروں کے نام فرمان جاری کیا کہ ملک آبائی خدا نے ہم کو عطا کیا دفع کفار فرنگ لازم ہے باہم شریک ہو کر باقی ماندہ کا بیلی گارد کو قتل کرو جو ان کو قتل کرے گا اس کا نصف علاقہ اس کو معاف ہوگا۔ فوج میں اعلان ہوا کہ تنخواہ حضرت محل دیں گی۔

مولوی احمد اللہ شاہ اور راجہ جے لال سنگھ نصرت جنگ نے بڑی شجاعت اور جانبازی دکھائی۔ عالم باغ کے معرکہ میں راجہ مان سنگھ نے ایسی شجاعت دکھائی کہ ان کو حضرت محل نے خلعت و رومال دوشالہ کے علاوہ فرزند خاص کا خطاب اور ملبوس خاص عطا کیا۔ چھتر منزل کے قریب جنرل نیل اور اس کی فوج ہندوستانیوں کے نرغہ میں آگئی۔ بڑا سخت معرکہ ہوا۔ ایک سپاہی نے شیر دروازہ کی چھت پر لیٹ کر ایسا نشانہ لگایا کہ جنرل نیل ہلاک ہوتے ہوئے گھوڑے سے گرے۔ موسیٰ باغ میں ہندوستانیوں کا بڑا توپ خانہ اور مضبوط مورچہ تھا۔ عالم باغ میں چھوٹے بڑے توپ خانوں کے ساتھ ہندوستانیوں کی ایسی طاقتور فوج تھی کہ اس سے لڑنے میں انگریزوں کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ یہیں دہلی سے ہزاروں محبانِ وطن اپنے بھائیوں سے آملے اور مغل

شہزادوں کے بیدردی سے قتل ہونے کا واقعہ بیان کیا۔ اُسی دن شہزادوں کا قاتل میجر ہڈسن گھوڑے پر نمودار ہوا۔ دہلی والوں کی آواز بلند ہوئی۔ اس نے شہزادوں کا خون پیا ہے۔ یہ سُنتے ہی ایک بانکے نے ہڈسن کا موزہ پکڑ کے گھوڑے سے نیچے کھینچ لیا۔ سینہ پر خنجر کا وار کر کے کام تمام کر دیا۔ لاش کے ٹکڑے چیل کوؤں کو دینے کے لئے اچھالے گئے۔ لڑائی کے بعد جو مل سکے وہ انگریزوں نے دفن کئے۔ عالم باغ میں اس کی لاٹ (قبر) موجود ہے۔

قیصر باغ میں نواب سعادت علی خاں اور ان کی بیگم کے مقبروں کے چاروں طرف توپیں انگریزوں پہ گولہ باری کر رہی تھیں اسی دوران اُدھر سے گوروں کا ایک دستہ گذرا جو ایک دھماکہ کے ساتھ فنا ہو گیا۔ یہاں زیر زمین بارود بچھی ہوئی تھی۔ یادگار ابھی تک موجود ہے۔

انگریزوں کو سرحد۔ پنجاب۔ اور نیپال سے برابر کمک پہونچ رہی تھی۔ اس کے علاوہ وطن کے غدار۔ غداروں کے بے مثال کردار ادا کر رہے تھے۔ انگریزوں نے مخبری اور جاسوسی کے جال پھیلا رکھے تھے ادھر ہندوستانیوں کا سامان جنگ اور رسد کم ہوتا جا رہا تھا۔ بجز لکھنؤ کے انگریزوں نے ہر جگہ غدر پر قابو پالیا تھا اور سب طرف سے انگریزی فوج کی یلغار لکھنؤ پر تھی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانیوں کے پیر اُکھڑنے لگے اور لکھنؤ میں ہر جگہ ہزیمت ہونے لگی۔ اس حالت میں بھی مُحبّانِ وطن نے لکھنؤ کے چپّہ چپّہ اور گلی کوچوں میں انگریزوں سے دست بدست جنگ کی۔ جب گولیاں اور بارود نہ رہا تو بندوق کے کُندوں اور تلواروں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

دہلی اور کانپور وغیرہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد جنرل بخت خاں اور ناناصاحب بھی لکھنؤ آ گئے تھے جو محبان وطن کی آخری اُمید گاہ تھی اور یہاں اس وقت تک شدت سے جنگ جاری تھی۔

حضرت محل کے شاہی پرچم تلے ہزاروں سرفروش وطن پر پروانہ وار نثار ہو رہے تھے۔ اس موقع پر نمک حرام مشیر الدولہ مہاراجہ بالکرشن سابق دیوان سلطنت اودھ جو در پردہ انگریزوں سے ملا ہوا تھا حضرت محل کو مشورہ دیا کہ تعلقداروں کو اپنے اپنے علاقوں پر جانے کا حکم دیجئے تاکہ وہاں سے روپیہ اور رسد لائیں۔ حضرت محل اس کے کہنے میں آگئیں۔ سب تعلقدار اپنی اپنی فوجیں لے کر لکھنؤ سے چلے گئے۔ انگریزوں نے عالم باغ پر بھرپور حملہ کیا ادھر حضرت محل کی قیام گاہ چولکھی پر بڑی سخت لڑائی ہوئی جسکے چاروں طرف لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ چولکھی پر قبضہ ہونے ہی کو تھا کہ اُسی وقت خان علی خاں ایک ہزار سپاہ لے کر آگئے اور غضب کا رن پڑا۔ حضرت محل چولکھی سے جانا نہیں چاہتی تھیں اور ان کے عزم اور استقلال میں فرق نہ آیا تھا لیکن جب لکھنؤ میں ہر طرف انگریزوں کا قبضہ ہونے لگا تو چولکھی چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں۔

سید کمال الدین حیدر صاحب مرحوم لکھتے ہیں۔ بحال تباہ مع دیگر بیگمات اور شاگرد پیشہ مستورات کے پھاٹک سے نکلیں۔ خود آگے تھیں اور سب صف بستہ۔ پیادہ پائی کی وجہ سے قدم قدم پر الجھتی اور ٹھوکریں کھاتی تھیں۔ ٹیلہ شاہ جلیل سے پُل مولوی گنج پر پہونچیں تلنگے ہر طرف متلاشی سواری تھے۔ رات کو غلام رضا کے یہاں قیام کیا پھر وہاں سے شرف الدولہ کے گھر گئیں وہاں سے محلسرائے حسین آباد گئیں۔

شام تک جتنا عملہ شاگرد پیشہ تھا سب جمع ہو گیا اور ان کی حفاظت کو پہرے کھڑے ہو گئے۔ علی رضا کے یہاں جنرل اوٹرم کا پیام پہنچا کہ ہم آپ کا ملک آپ کو واپس کریں گے جنگ سے دست بردار ہو جائیے فوج مغلوبہ کے ساتھ کہیں نہ جائیے۔ حضرت محل نے اسے منظور نہ کیا اور صلح نامہ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

جس سرزمین پر آنکھ کھولی تھی اور زندگی کے بہترین دن گزارے تھے اس سے جدا ہونے کو جی نہ چاہتا تھا مجبوراً ۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء کو لکھنؤ کو خیرباد کہا۔ لکھنؤ سے نکل کر حضرت محل خاموش نہ بیٹھیں اور نئی فوج کی تیاری میں لگ گئیں۔ پرانے رفقاء اور جاں نثار بھی ان سے آملے۔ جب وہ بٹولی پہنچیں تو چھ ہزار مسلح فوج ان کے ساتھ تھی وہاں ان کو معلوم ہوا کہ مولوی احمد اللہ شاہ نے شاہجہان پور کا محاصرہ کر لیا ہے اور ان کو کمک کی ضرورت ہے۔ اپریل میں وہ ان کی مدد کو پہنچیں وہاں مولوی مذکور کو شکست ہو چکی تھی اس لئے واپس ہو کر چوکا گھاٹ پر پڑاؤ ڈالا جو لکھنؤ سے پورب دریائے گھاگرا کے کنارے نیپال کی ترائی کے قریب ہے۔ بہرائچ میں لارڈ کلائیڈ کی فوج سے مقابلہ کیا۔ اس لڑائی میں ان کے ایک افسر سید قطب الدین شہید ہو گئے حضرت محل نیپال روانہ ہوئیں۔ ان کے نیپال میں مقیم ہونے کی خبر سنکر ہزاروں جاں نثاروں نے بھی ادھر کا رخ کیا۔

لکھنؤ میں انگریزی تسلط ہو جانے کے بعد متعدد مقامات اور قیصر باغ کے چوراہے پر پھانسیاں نصب کی گئیں۔ جنگ آزادی میں شریک ہونے والے جو بھی مل سکے بلا امتیاز ان کو تختہ دار پر

چڑھا دیا گیا۔ عمائدین کاکوری میں منشی رسول بخش صاحب اور ان کے بڑے صاحبزادے منشی عبدالصمد صاحب کو گوروں کی فوج کے ایک دستہ نے ان کی کوٹھی میں گرفتار کیا اس لئے کہ وہ بھی شہزادہ برجیس قدر کی تاجپوشی میں شریک تھے۔ لکھنؤ میں رات بھر قید رکھنے کے بعد صبح ہوتے ان سے آخری خواہش پوچھی گئی۔ دونوں نے پانی مانگا۔ مسجد کے سامنے ٹیلہ شاہ پیر محمد صاحب پر باپ کے سامنے بیٹے کو پھانسی دی گئی۔ ان کے بعد منشی رسول بخش صاحب کو دی گئی اور وہیں دفن کر دیا گیا۔ تیسرے دن منشی صاحب موصوف کے وفادار ملازم سالار بخش دونوں لاشیں کاکوری لائے اور منشی صاحب کی مسجد میں دفن کیں۔ لکھنؤ کے کئی سو معززین اور نواب حیدر خاں بنگش مع اپنے اکلوتے فرزند کے لب سڑک کاکوری روڈ پر انگریزوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے ان شہداء میں راقم کے پرنانا اور ان کے چھوٹے بھائی احمد علی صاحب بھی تھے۔ ان شہداء میں سُنی شیعہ سب ہی تھے۔ ان سب کو ایک ہی قبر میں موضع سلیم پور اینٹھی میں دفن کیا گیا۔ لب سڑک ایک بڑا مزار ہے جو گنج شہیداں کے نام سے موسوم ہے۔ احمد علی صاحب کچھ فاصلہ پر شہید ہوئے تھے اس لئے وہ موضع ماہ بیت مئو میں دفن ہوئے۔

نواب ممو خان جو حضرت محل کے خاص معتمد تھے مہاراجہ نیپال نے ان کو دھوکہ دے کر انگریزوں کے ہاتھ گرفتار کرا دیا۔ لکھنؤ لائے گئے پھانسی کی سزا ملی مگر بعد میں کالے پانی بھیجدیا گیا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ نواب ممو خان کی گرفتاری کے بعد وہ ہزاروں باشندگان اودھ جو نیپال

پہونچ گئے تھے پریشان ہو گئے لیکن حضرت محل نیپال ہی میں مقیم رہیں۔ عرصہ تک انگریز ان کو فیض آباد اور لکھنؤ میں لانے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ نہ آئیں۔ ایک انگریز مصور جو مرزا برجیس قدر کی تصویر کھینچنے وہاں گیا تھا اس کے ذریعہ آخری پیغام بھیجا گیا کہ فیض آباد یا لکھنؤ جہاں رہنا چاہیں آ جائیں وظیفہ کے علاوہ احترام شاہانہ کا بھی لحاظ رکھا جائے گا لیکن حضرت محل نے یہ آخری پیش کش بھی قبول نہیں کی۔ جب تک زندہ رہیں نہ خود آئیں اور نہ شہزادہ برجیس قدر کو آنے دیا۔

حضرت محل نے اپریل ۱۸۷۹ء میں نیپال میں انتقال کیا اور ایک مسجد میں دفن ہوئیں۔

ایک تاجر جو نیپال گئے تھے ان کا بیان ہے کہ حضرت محل کی قبر اب بوسیدہ حالت میں ہے۔

والدہ کے انتقال کے بعد شہزادہ برجیس قدر اپنے والد سلطان عالم واجد علی شاہ کے پاس کلکتہ چلے گئے تھے وہاں ایک قریبی عزیز نے ان کی دعوت کی۔ ان کو مع بیگم اور فرزند زہر دے دیا اور تینوں راہی ملک بقا ہوئے

باکمال اہلِ فن و اہلِ ہنر

خوش نویس

جناب مولانا عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی لکھتے ہیں کہ علوم ہی سے وابستہ کتابت اور تحریر کے فن ہیں۔ آغا عبدالرشید دیلمی کے دو

شاگرد حافظ نوراللہ اور قاضی نعمت اللہ وارد لکھنؤ ہوئے اور کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بیگ نامی تیسرے شاگرد بھی لکھنؤ آئے۔ ان حضرات کی آمد کا زمانہ غالباً نواب آصف الدولہ بہادر کا عہد تھا۔ قاضی نعمت اللہ شہزادوں کی اصلاح پر مامور ہوئے اور حافظ نوراللہ کا تعلق دربار اودھ سے ہو گیا۔

عہد شاہی میں اُمراء اور شوقین لوگ اپنے مکانوں کو بجائے تصویروں کے قطعات سے آراستہ کرتے تھے جسکی وجہ سے اس فن کو بہت فروغ ہوا اور شاہان اودھ کی قدردانی سے صدہا باکمال خوش نویس دُور دُور سے کھنچ کر لکھنؤ میں جمع ہو گئے تھے۔ دُور دراز شہروں میں یہاں کے خوش نویسوں کے کتبے اور اس شہر کی عمارات قدیم پر اودھ کے خوش نویسوں کے لکھے ہوئے پتھر اب تک ان کے کمال کی یادگار رہی۔

نواب سعادت علی خان خطِ شکستہ کے کامل خوش نویس تھے۔ عہد آصفی میں حافظ نوراللہ اور ان کے بیٹے حافظ ابراہیم ایسے بے مثل خطاط گزرے ہیں جن کا جواب نہ اُس وقت تھا نہ اب ہے۔ خربزہ کے بیج پر لکھنا۔ چاولوں پر قل ہو اللہ۔ چنے کی دال پر سورہ فاتحہ لکھنے والے صدہا خوش نویس تھے۔

امام باڑہ حسین آباد پر طغرے عہد محمد علی شاہ کے خوش نویسوں کے کمال اور تاک کٹورے وعیش باغ کی کربلا اور مزاروں پر خط ثلث کے کتبے اس فن کے انتہائی عروج پر ہونے کی دلیل ہیں بلکہ عہد شاہی کی زندہ تاریخیں ہیں صدہا خوش نویسوں کی لکھی ہوئی کتابیں جابجا موجود ہیں چنانچہ ایک شاہنامہ

اور ایک شاہجہاں نامہ مطلا مذہب اعلیٰ درجہ کے خوش نویسوں کے لکھے ہوئے لندن کے کتب خانہ میں بھیج گئے یہی کمال ہے جسکو مٹتے مٹتے بھی چھاپہ خانہ کے خوش نویسوں نے سنبھال لیا اور اب تک لکھنؤ کے بہت لوگ چھاپہ خانہ کی کتابت پر زندگی بسر کرتے تھے۔ سابقہ قدردانیوں کی وجہ سے اب تک مطابع کی ترقی کے زمانہ میں جیسے کاتب لکھنؤ میں ملتے ہیں اور کہیں نہیں ملتے۔ اودھ اور لکھنؤ کے موجودہ خوش نویسوں کی تحصیل خطاطی کا سلسلہ جاکر عہد آصفی کے درباری خوش نویس حافظ نوراللہ پر ختم ہوتا ہے جن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کتبے امام باڑہ آصفی کی مسجد پر باقی ہیں جو امام باڑہ آصف الدولہ مرحوم اور اس کے سامنے کنوئیں کی جگت کے پتھر پر کندہ ان ہی حافظ نوراللہ کے زورِ قلم کا تاریخی ثبوت ہے۔

حافظ نوراللہ۔ عہد آصفی و عہد سعادتی کے کامل خوش نویس تھے ان کی معمولی مشق بازاروں میں ایک روپیہ فی حرف کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھی۔ گلستان کے صاحب نواب یمین الدولہ کی فرمائش پر تحریر کرکے انتقال کر گئے۔ ان کا کتبہ ان کے بیٹے حافظ ابراہیم خوش نویس نے پورا کر دیا۔ حافظ نوراللہ نے تحفۂ آصفیہ بخط نستعلیق نواب آصف الدولہ کے لئے لکھی تھی یہ کتاب پبلیس لائبریری مرشد آباد میں ہے۔

حافظ ابراہیم۔ عہدِ آصفی سے عہدِ نصیری تک زندہ رہے۔ یہ استادِ زمانہ عہدِ آصفی کے خوش نویس حافظ نوراللہ کے بیٹے اور اپنے باپ کے شاگرد تھے نستعلیق ایسا لکھا کہ پھر

ان کا جواب دینے والا کوئی پیدا نہ ہوا۔ حافظ ابراہیم نے محتشم کاشی کا مشہور مرثیہ لکھکر آغا میر وزیر اعظم کو پیش کیا تھا جو خطاطی کے نمونے کا اعجاز ہے۔ حافظ ابراہیم کا یہ کمال مشہور ہے کہ ان کے والد حافظ نور اللہ نے نواب سعادت علی خان کی فرمائش پر جو گلستان لکھی تھی اور جس کا ایک آخری باب تمام نہ ہوا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ نواب کی فرمائش اس بقیہ باب کی تکمیل کے لئے ان سے ہوئی انہوں نے اپنے باپ کی شانِ خط میں لکھکر ایسا ملا دیا کہ ماہرین فن بھی پہچان نہ سکے۔

منشی غلام مرتضیٰ کاکوروی کا حافظہ بہت قوی تھا کتابت میں اس قدر تیز دست تھے کہ ایک مرتبہ خان آرزو شاہجہان آباد (دہلی) سے عظیم آباد (پٹنہ) جاتے ہوئے لکھنؤ میں ٹھہرے سراج اللغت انہوں نے اسی زمانہ میں لکھی تھی جو تقریباً بیس جزو کی تھی۔ یہ اُن سے دیکھنے کو لائے اور رات بھر میں نقل کر لی۔

شیخ رحیم الدین خط نستعلیق میں کامل تھے۔ گلستان ایک رات دن میں لکھی۔ وہ کتاب محررہ ۱۲۱۷ھ موجود ہے۔

مولوی محمد رشید فتحپوری۔ لکھنؤ کے ایک خوش نویس کے شاگرد تھے۔ نستعلیق و نسخ کے کامل تھے۔ خط غبار و گلزار و شفیعہ سے ماہر۔ چنے کی دال پر پورا سورۂ قل ہو اللہ مع بسم اللہ بخط واضح لکھتے تھے

غلام محمد خان - اُستادِ زمانہ تھے۔ شبیہ کشی میں اتنے کامل تھے کہ نقل کو اصل کر دکھاتے تھے۔ ناخون نویسی میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔

سید احمد طباطبائی - خطِ نسخ کے لاجواب خوش نویس تھے قرآن شریف لکھا کرتے تھے۔ ان کا مقبرہ لکھنؤ راج گھاٹ میں گومتی کے کنارے تعمیر ہوا۔ مزار پاک ان کا مرجع ارباب حاجت تھا۔ پھول و چراغ اہل حاجت لالا کر روشن کرتے تھے۔

ایک بے مثل خطاط - ۴۲×۱۲ انچ کا ایک قرآن شریف شاہی خوش نویس نے نصیر الدین حیدر کے لئے لکھا تھا جسکی قیمت ۳۰ تیس ہزار روپیہ تھی۔ یہ قرآن شریف وکٹوریہ میموریل کلکتہ میں موجود ہے۔

امیر اللہ تسلیم - سندیلہ کے خوش نویس منشی عبدالحئی کے شاگرد اور نستعلیق میں کامل تھے۔ عہد واجدی میں فوج میں ملازم تھے جب پلٹن ٹوٹ گئی اور یہ بیکار ہوئے تو بادشاہ کو عرضی دی جس پر بادشاہ نے یہ حکم لکھا

ع بشنوائے خوش نویس وائے خوش گو ؛ ہر دو فن میکنی و ہر دو نکو
اسمِ تو مندرج بدفتر شد ؛ بست و دہ روپیہ مقرر شد

حاجی حافظ ہادی علی بنارسی - تحصیل علم لکھنؤ میں کیا۔ قصبہ کاکوری میں دفن ہیں۔ ہفت قلم تھے۔ سنہ ۱۲۳۴ھ سے مستقل قیام لکھنؤ

میں تھا۔ اخیر میں نابینا ہو گئے تھے۔ انہوں نے حضرت مولانا شاہ تراب علی قلندر کے مزار کی مسہری کے لئے ایک چھت کپڑے کی بنوائی اور اُس پر بجائے مداخل کے سورہ آیۃ الکرسی بخط نسخ لکھی اور اسکے درمیان میں سورۂ اخلاص کا طغرا لکھا۔ نابینائی میں یہ کمال تھا کہ چھت گیری لکھتے وقت حافظ عزیز حسن صاحب سے کہا کہ جہاں سے حرف لکھوانا ہو وہاں میرا ہاتھ رکھدو چنانچہ حافظ صاحب ہاتھ رکھدیتے تھے اور یہ لکھتے جاتے تھے۔ یہ چھت گیری موجودہ سجادہ نشین کاکوری کے پاس اب تک موجود ہے۔

نواب ملکہ جہاں۔ محمد علی شاہ کی بیگم تھیں۔ خطِ نسخ میں باکمال تھیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی سوانح عمری ڈھائی سو صفحہ کی لکھی تھی یہ ان کے پرپوتے کے پاس تھی۔ ملکہ جہاں نے پورا قرآن شریف اپنے ہاتھ سے لکھا جس کے پندرہ پارے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مزار اقدس پر اور پندرہ پارے حضرت امام حسین علیہ السلام کے مزار پُرانوار پر چڑھائے۔

میر احمد حسین حسن الحسینی ولد میر سید علی لکھنوی نیشاپوری ایسے کامل خوش نویس تھے کہ میر عماد کے کتبوں میں خط ملا دیا لارڈ منٹو وائسرائے نے انکے ہاتھ کی جلی تحریر رامپور میں دیکھکر کہا کہ یہ قلم کی تحریر نہیں ہے۔ انہوں نے موصوف کے سامنے لکھکر مطمئن کر دیا۔

شعراء

جب نواب شجاع الدولہ نے بیت السلطنت فیض آباد کو اپنا مستقل مستقر قرار دیا اور اہل فن اور اہلِ ہنر کی قدردانی کا نیا دروازہ کھلا تو دلّی اور دیگر اطرافِ ہند سے اہلِ کمال یہاں آنے لگے۔ آب و دانہ اور خاکِ گور کی کشش نے ان کو اسی سرزمین کا دائمی مہمان بنا لیا۔ اسی ضمن میں شاعر بھی کھنچ کھنچ کر یہاں آنے لگے۔

نواب آصف الدولہ نے فیض آباد سے جب دار السلطنت لکھنؤ منتقل کیا تو لکھنؤ شعراء اور ہر فن کے باکمالوں کا مرکز ہو گیا اور لکھنؤ اسی وقت سے اردو زبان کا مستند مرکز بن گیا۔ یہاں کی زبان ٹکسالی زبان مانی گئی۔

نواب آصف الدولہ کے عہد میں اُجڑی ہوئی دلّی کے باکمالوں کو لکھنؤ میں پناہ ملی جن کی قدردانی اور حوصلہ افزائی میں فیّاض نواب نے بے دریغ سیم و زر لٹا دیا۔ دلّی کی شاعری کا باغ تاراج ہوا تو سب سے پہلے نواب موصوف کا دستِ کرم اٹھا اور تمام غریب الوطنوں کی اعانت و دستگیری کا فرض ادا کرنے لگا جو ذی کمال آیا اس کی قدر ہوئی۔ آصفی دربار علماء فضلاء اور نغز گفتار شعراء سے مملو ہو گیا۔

اودھ کے بادشاہوں نے صرف اہلِ زبان شعراء و اُدباء کامل اور باکمال اہلِ ہنر کی خاطر تواضع ہی نہیں کی اور ان کی قدردانی میں اشرفیوں کے توڑے ہی نہیں کھول دیئے بلکہ خود بھی انہوں نے زبانِ اردو کی بہت خدمت کی۔

نواب آصف الدولہ خود نازک خیال شاعر تھے اور شاعری کے قدردان

داد و دہش میں مشہور۔ اُمرای رؤسای بادۂ شاعری سے سرشار تھے۔ موصوف کے عہد میں بڑے بڑے محلوں میں دھوم دھام سے مشاعرے ہوتے تھے اور شاعری کے خوب چلے ملتے تھے۔

نواب شجاع الدولہ سے لے کر سب شاہان اودھ نے نیز اُمراء رؤسای وزراء نے دامے درمے قدمے سخنے اُردو کی ہر طرح خدمت کی اور زبان و ادب اُردو پر نا قابل فراموش احسان کر گئے۔ ان کے عہد میں صرف لکھنؤ میں اتنے شعراء تھے جتنے اس وقت پورے ہندوستان میں نہ تھے۔

واجد علی شاہ بہت طبیعت دار شاعر و ادیب تھے۔ انہوں نے صدہا محاورات و الفاظ کے اختراع میں دلچسپی لی۔ بہت لوگ بادشاہ سے اصلاح لیتے تھے۔ یہ آج اُردو کی جو قدر و قیمت ہے بہت کچھ شاہانِ اودھ کی رہین منت ہے۔ اگر یہ اپنے فیاض ہاتھوں کو ادھر سے کھینچ لیتے تو نہ میر تقی میر یہاں آتے نہ مرزا رفیع سودا کا مزار یہاں ہوتا۔ انشاء اللہ خان انشا۔ آتش۔ ناسخ۔ جرأت۔ امانت۔ ہنر۔ سرور سحر۔ درخشاں۔ اسیر۔ قلق۔ ذکی۔ قبول۔ وزیر۔ بحر۔ صبا رند وغیرہ اتنے باکمال شاعر اس سرزمین پر نہ گزرتے جن کی فہرست بھی طولانی ہے۔ مرزا دبیر و میر ببر علی انیس نے مرثیہ خوانی میں ایسے ایسے کمالات شاعری دکھائے کہ شعر و سخن کے آسمان پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ اردو ادب میں وہ نئی چیزیں پیدا کر دیں جن کو انگریزی تعلیم کے اثر سے طبیعتیں ڈھونڈھنے لگی تھیں۔ اُردو شاعری کی ایک قسم واسوخت ہے۔ نظم اُردو کی یہ قسم لکھنؤ ہی میں شروع ہوئی۔ ہزل گوئی کو عہد شاہی کے

آخری دور میں شیخ گوہر علی مشیر نے کمال کے درجہ پر پہنچا دیا۔ واجد علی شاہ کے عہد میں اردو ڈرامہ کی ابتدا ہوئی۔ سب سے پہلا ڈرامہ اندر سبھا امانت لکھنوی نے ۱۸۵۳ء میں تصنیف کیا۔

یہاں کی شاعری نے طرح طرح سے تہذیب و تمدن کی ترقی میں مدد دی اور اہلِ شہر میں سلیقہ اور مذاقِ سلیم کا جذبہ پیدا کرنے میں نمایاں حصہ لیا اردو کے ساتھ فارسی غزلوں کے مشاعروں سے ملک میں علمی و ادبی چرچا بڑھا جس سے معلومات میں اضافہ ہوتا گیا۔ درباری زبان فارسی تھی

شاہی عہد کے آخری دور تک فصاحتِ زبان اور شاعری نے لکھنؤ میں مضبوط جگہ حاصل کر لی تھی۔ حیدری دور میں شعر کہنا ایک وضعداری تھی۔ شعراء کی یہاں اتنی کثرت ہوئی کہ شاید کہیں کسی زبان میں ہوئی ہو۔

شاہی بیگمات کا کیا ذکر شرفاء کی بیگموں میں شعر و سخن کا چرچا تھا اور جہلا کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک پائی جاتی تھی نظم و نثر کا دربار میں اس قدر چرچا تھا کہ تحریر در کنار گفتگو میں مجال نہ تھی کہ کسی کی زبان سے کوئی غلط یا خلاف محاورہ لفظ نکل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اسباب سودے والوں کی صداؤں میں استعارے اور تشبیہوں کی جھلک موجود ہے اور ابھی تک یہاں کے جہلا کی زبان اس قدر شستہ و رفتہ اخلاقی حفظِ مراتب کے الفاظ سے مملو اور تمدنی آداب سے لبریز ہے کہ اکثر صاحبانِ علم ان کی گفتگو سنکر ششدر رہ جاتے ہیں اور اکثر ذی علم حضرات انکے جاہل ہونے کی تمیز نہیں کر سکتے۔

فصاحتِ زبان کی یہ کیفیت تھی کہ انگریزی عملداری کے آغاز تک چار پانچ برس کے بچے اپنے بزرگوں سے گفتگو میں اس طرح کے فقرے بولتے تھے

آپ کہاں تشریف لئے جاتے ہیں ابر شہر گیر اُٹھا ہے تو تنہا ہوا چاہتا ہے۔

اشرف علی خان فغاںؔ۔ اردو کے نامور اُستاد شہنشاہ دہلی کے کوکا تھے۔ عہدِ نواب شجاع الدولہ میں کمال کی قدر دانی کی تمنا لے کر دلی سے فیض آباد آئے۔ شجاع الدولہ نے بڑی تعظیم و تکریم سے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک زمانہ تک دربار میں رکھا۔

آخر فغاں وہی ہے اُسے کیوں بُھلا دیا :: وہ کیا ہوا تپاک وہ اُلفت کدھر گئی

نواب آصف الدولہ آصفؔ تخلص

پوچھتے کیا ہو شبِ ہجر کی حالت یارو :: میں ہوں اور رات ہے اور بسترِ تنہائی ہے

برقعے شکوہ سے جاتا ہے فائدہ دل کا :: چھکے گا رو برو کس کے معاملہ دل کا

خط جو آیا تو ہوا رشک سے آصفؔ کا یہ حال :: رشک کے مارے دکھایا نہ کسی کو کاغذ

جو جلوے صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں :: خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں

بتوں کی گلی میں شب و روز آصفؔ :: تماشہ خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

شوخیٔ چشم کی شہرت کو تری سُن سُن کر :: شرم سے باغ میں نرگس نے چھپائیں آنکھیں

نواب شمس النساء بیگم دہلوی۔ خطاب نواب بہو۔ نواب آصف الدولہ کی خاص محل تھیں۔ خواجہ وزیر لکھنوی کی شاگرد تھیں۔ شمسؔ تخلص تھا

اس گُلِ تر کی صفت میں جو غزل خواں ہوتا
گُلِ مضموں سے گُلستان مرا دیوان ہوتا

اس پری زاد کو میں تابعِ فرماں کرتا :: میں افسونِ محبت کا جو عامل ہوتا

بیان میں کس سے کروں جا کے ماجرا دل کا :: یہ دل کا دل ہی میں ہو وے گا فیصلہ دل کا

منشی صاحب رائے۔ عہدِ آصفی اور سعادتی کے مورّخ ایک اچھے تاریخ گو اور مشہور شاعر تھے۔ ایک دن نواب آصف الدولہ عیش باغ کے پھاٹک سے جا رہے تھے دیکھا کہ پھاٹک پر جو مٹی کا شیر ہے اس کے دہن میں طوطے نے اپنا آشیانہ بنایا ہے۔ نواب نے مسکرا کر صاحب رائے کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔

قربان شہ کے صدقہ کیا عدل کا نشان ہے
جو شیر کے دہن میں طوطے کا آشیان ہے

ایامِ ہولی میں مے نوشی کی اجازت حاصل کرنے کے لئے منشی موصوف نے نواب سعادت علی خان کو عرضی دی ؎

ترکِ مے ایامِ ہولی میں کہو کیا کیجئے ؛ جی میں آتا ہے کہ اس صورت میں کنٹھی لیجئے
گر تماشہ کائتھوں کا دیکھنا منظور ہو ؛ شاہ دو دن کے لئے ہم کو اجازت دیجئے

حکمِ نواب صاحب۔ محتسب را درونِ خانہ چہ کار

ایک دن دیر تک منشی مذکور منتظر بار یابی رہے۔ آخر بارگاہِ سلطانی پر عرضی بھیجی ؎

اے سلیماں جاہ کیا ارشاد ہے ؛ دیر سے حاضر یہ خانہ زاد ہے

جواب شاہ ؎

آج جاؤ کل مگر آنا ضرور ؛ دم بہ دم دل میں تمہاری یاد ہے

نواب عالم آرا بیگم۔ واجد علی شاہ کی پہلی ملکہ تھیں عالمؔ تخلص تھا ؎

نہیں ایک وضع پہ جہاں کا رنگ ؛ عارضی ہے فقط یہاں کا رنگ
خود غرض ہوتے ہیں جہاں کے دوست ؛ جب غرض نکلی پھر کہاں کے دوست

قائلِ انتظام سے تھے انگریز ∴ ملک آباد اور زمیں زرریز

ہے شبِ وصل گر دل میں ہے دھڑکا عالم
بول اُٹھے نہ کہیں مرغِ سحر آج کی رات

قہر تیور غضب کی چتون ہے ∴ ماشاءاللہ آج جوبن ہے

واجد علی شاہ - کا کلام ہر صنف میں موجود ہے۔ غزل۔ سلام (اختر تخلص کرتے تھے) مرثیہ۔ مثنوی۔ قصیدہ وغیرہ کے علاوہ نثر کی کتابیں بھی ہیں۔ اتنی تصانیف شائد ہی کسی بادشاہ کی ہوں۔ پورا کلام اب ملتا کہاں ہے۔ بادشاہ نے ہندی الفاظ و محاورات کے مستند طور پر ترقی استعمال میں اور اُردو زبان کی وسعت کو ترقی دینے میں بڑا حصہ لیا ان کا کلام صفائی اثر اور درد کا مجموعہ ہوتا تھا۔ کلکتہ کے سفر کے دوران انہیں تکلیفیں پہونچیں۔ اِس سفر میں انہوں نے یہ بے مثل شعر کہا تھا؎

زمانہ تھا ایسا کرتے تھے گوہر پاؤں کے نیچے
پر اب ہے دھوپ سر پر اور کنکر پاؤں کے نیچے

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالہ میں ∴ لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

یوں تو شاہانِ جہاں پر ہے پڑا وقت مگر ∴ ختم ہے اختر بیکس پہ جفائے غربت

قید ہونے سے کہیں نوبت ریاست جائے گی ∴ لاکھ گردش آسمان کو ہو زمیں ہوتا نہیں

مرض الموت میں
آہ کرتا ہوں تو سب لوگ خفا ہوتے ہیں
اے نسیم سحری ہم تو ہوا ہوتے ہیں

سُلطانِ عالم نے سیکڑوں عمردوں۔ عورتوں۔ عمارتوں۔ باغوں

جانوروں اور خاصے کی چیزوں کو اتنے خطاب دیئے جن کی تعداد ہزاروں تک پہونچتی ہے اور ان کو اس میں اتنا عمدہ ادبی سلیقہ تھا کہ شاذ و نادر ہی کسی فرمانروا میں ہوگا۔ یہ خطاب اتنے دلکش اور خوبصورت ہوتے تھے اور ان کی خوبی اسی وقت معلوم ہو سکتی تھی جب وہ چیز یا شخص سامنے ہو۔

پرنس مرزا محمد سکندر قدر تیموری۔ تدبیر ؎

شکوہ جفا کا سُنکے یہ کہتے ہیں ناز سے
کچھ دل لگی نہیں جو کسی سے لگائے دل
تدبیر اب یہ سوچے ہیں تدبیر خوب ہم
پھر دل نہ دیں کسی کو جو پھر کے آئے دل

میر حسن دہلوی۔ مثنوی سحر البیان ان کے کمال کا آئینہ ہے آصفی عہد میں ان کی شیریں بیانی مشہور تھی ؎

وہ پھولوں کی خوشبو وہ ستھرا پلنگ
جوانی کی نیند اور وہ سونے کا رنگ

میر محمدی سوز۔ نواب آصف الدولہ کے استاد تھے۔

سر زانو پہ ہو اس کے اور جان نکل جائے
مرنا تو مُسلّم ہے ارمان نکل جائے

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

راجہ شبو کمار وفا۔ آصفی عہد کے وقائع نگار تھے۔

مشتعل رات وہ آتش تھی مرے سینہ میں
کہ نہ رکھا گیا ہاتھ اپنے جگر پر اپنا

دیا شنکر نسیم۔ مصنف مثنوی گلزار نسیم۔ عہد امجد علی شاہ میں فوج میں بخشی گری کے عہدہ پر مامور تھے۔

گل ہوا کوئی چراغ سحری اُڑ بلبل
ہاتھ ملتی ہوئی پتوں سے صدا آتی ہے

گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا
شاخِ گل ایک روز جھونکا کھائے گی

حسام الدولہ محمد نقی علی خان متخلص بہ حسام۔ امجد علی شاہ کے خوش نویس تھے۔

عارضِ حسن پر اتنا نہیں لازم ہے غرور
ہوں اگر چاند سے اے ماہ دو چنداں عارض

دیا کرشن ریحان۔

صدائے صورت سے کم نہیں کچھ دل کے نالے ہیں: تب ہی تک خیر ہے جب تک طبیعت کو سنبھالے ہیں

نواب مرزا تقی ہوس۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں ان سے یادگار ہے۔ مصحفی کے شاگرد تھے ؎

کی راہِ محبت میں مشقت جو انہوں نے
اتنا ہمیں معلوم نہ تھا حوصلہ پایا
ہم جا نہیں سکتے ہیں یہاں ہوس شرم کے مارے
ہر چند گھر اس کا ہے بہ یک فاصلہ پایا

مقبول الدولہ مرزا مہدی علی خان قبول۔ عہدِ واجدی میں توپ خانہ کے داروغہ تھے ناسخ کے شاگرد تھے ؎

حسن سے عشق کا ظہور ہوا ÷ نور سے نار کیوں نہ پیدا ہو
قبول ناسخ مرحوم کا جواب نہ تھا ÷ خدا ہی جانے کہ مرزا مہیر کینہ تھے

حسام الدولہ فقیر محمد خان گویا۔

چاندنی سایہ ہے شب زلف ہے اختر افشاں
جسکو مہتاب سمجھتے ہیں کسی کا ہے وہ رُخ
فاصلہ شام و سحر میں نہ رہا ہے گویاؔ
دیکھ لے متصل زلف چلیپا ہے وہ رُخ

رام دیال سخن۔ آتش کے شاگرد تھے ؎

نگاہِ یار سے بچنا ہے اے سخن دشوار
پڑا ہے دشمنِ جاں سے مقابلہ دل کا

شیخ علی حسین جویا۔ پٹنہ عظیم آباد سے عہدِ نصیری میں لکھنؤ آئے رشک کے شاگرد تھے ؎

کیا صفائی ہے ٹھہرتی نہیں چشمِ پُرنم
اے پری آئینے کو کرتے ہیں حیراں عارض

شیخ امام بخش ناسخ۔ عہدِ نصیری کے بے مثل شاعر تھے۔ انہوں نے زبان اُردو کے محاورہ کو بہت درست کیا ؎

ناتوانی سے گراں سُرمہ ہے چشمِ یار کو
جس طرح ہو رات بھاری مردمِ بیمار کو

شراب کیوں نہ چلے فصلِ گل ہے اے زاہد
کہ نہریں جاری ہوئیں موسمِ بہار آیا

خواجہ حیدر علی آتش۔ آتش بھی عہدِ نصیری میں تھے۔ انہوں نے زبان کو صاف اور پُر لطف بنایا ؎

صبحِ بہار ہے مجھے ساقی پلا شراب
سب جانتے ہیں عید کا روزہ حرام ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

راجہ جیالال گلشن۔ محمد علی شاہ کے عہد میں تھے ؎

گلشن نہ مضطرب ہو شبِ وصل ہے اخیر
دن وعدۂ وصال کے دو چار رہ گئے

پیر بخش نام حمید الدولہ رضا قلی خان بہادر خطاب ناظر تخلص تھا۔

ہم یہ سمجھے تھے محبت میں بہل جائے گا دل
یہ نہ معلوم تھا رنگ اور ہی کچھ لائے گا دل

"سراپا سخن وغیرہ"

موسیقی دان

موسیقی غذائے روحانی ہے۔ اس کا خوشگوار اثر براہ راست دل و دماغ پر پڑتا ہے اور بعض امراض میں شفا کا حکم رکھتا ہے مثلاً امراض دل و دماغ وغیرہ۔

انسانوں اور حیوانوں پر مختلف سازوں کا اثر مختلف ہوتا ہے مثلاً ستار۔ سرود۔ جلترنگ۔ پیانو۔ ہرمونیم۔ بیگ پائپ۔ بین بانسری۔ شہنائی وغیرہ کا اثر ہر ذی روح پر جداگانہ ہوتا ہے۔ جب کوئی خوش گلو گاتا ہوتا ہے تو اکثر انسان اور بعض حیوان ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں۔ بعضوں پر ایک محویت طاری ہو جاتی ہے۔ بعض جھومنے لگتے ہیں اور بعض اشخاص پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ عالم بے اختیاری میں ان کے اعضاء پھڑکنے یا حرکت کرنے لگتے ہیں۔

سانپ بین یا بانسری کی آواز پر عاشق ہے۔ مشہور ہے کہ جب سری کرشن جی بانسری بجاتے تھے تو سبزہ زار پر چرتی ہوئی گائیں بھینسیں ہمہ تن گوش ہو جاتی تھیں۔

اکثر لوگ درد بھرے راگ اور نغمہ سے متاثر ہو کر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے گانے کو جادو کہا جاتا ہے۔

صوفیائے کرام اور اولیائے عظام میں کیفیت حال و قال پیدا ہونا انہی اثرات کی ایک نوع ہے۔

تاجداران اودھ نے فن موسیقی میں بہت بڑی دلچسپی لی اور ان کی سرپرستی کی وجہ سے بڑی حد تک یہ فن مٹنے سے باقی رہ گیا۔

نواب شجاع الدولہ کی قدردانی اور فیاضی سے سارے ہندوستان کے موسیقی دان اودھ کی سرزمین پر اکٹھا ہو گئے تھے اور موسیقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

باکمال اہل فن نواب۔ امرا اور رؤسا کے یہاں ملازم رہے۔ اور بڑی بڑی تنخواہیں پاتے رہے۔ فن موسیقی کی ترقی اور سرپرستی میں کثیر رقم صرف ہوتی تھی۔

بظاہر یہ اسراف معلوم ہوتا ہے لیکن فراوانی دولت پر نظر کر کے اس سے ہزارہا بندگانِ خدا کو فائدہ پہنچتا تھا اور فنونِ لطیفہ کو ترقی ہوتی تھی۔ اُس وقت یہ دولت کا بے جا مصرف نہ تھا۔

نواب آصف الدولہ کے عہد میں موسیقی پر ایک لاجواب کتاب اصول النغمات الآصفیہ لکھی گئی۔ ہندوستان میں اس سے بہتر کتاب اس فن پر نہیں لکھی گئی۔

ہر سال ہولی اور بسنت بہار میں نواب آصف الدولہ جشن عام کرتے تھے جس میں ساٹھ لاکھ روپیہ صرف ہوتا تھا اور بے شمار مخلوق اس صرف سے مستفیض ہوتی تھی۔

بادشاہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں بسنت کا جشن خاص اہتمام سے ہوتا تھا۔ ایسا بسنت لکھنؤ میں کبھی نہیں ہوا۔

خواجہ حسن مودودی۔ یہ عہد نواب آصف الدولہ اور سعادت علی خان میں گزرے ہیں باوجود عطائی ہونے کے فن موسیقی میں دُور دُور تک ان کا جواب نہ تھا۔ یہ مصنف نغمات الآصفیہ کے استاد تھے ان کے کمال کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مرہٹوں کی دست برد کے زمانہ میں وہ پالکی پر سوار لکھنؤ سے اٹاوہ کی طرف جا رہے تھے راستہ میں کسی گاؤں سے گزر ہوا جہاں مرہٹے تاخت کرنے والے تھے۔ کہاروں نے خواجہ صاحب کی پالکی رکھ دی اور آگے جانے سے عذر کیا۔ خواجہ صاحب نے بعد نماز عصر الاپنا شروع کر دیا اس گانے سے کہار تازہ دم ہو گئے اور اتنے متاثر ہوئے کہ خواجہ صاحب کو امن کی جگہ پہنچا دیا۔

حیدری خان۔ یہ بھی عطائی تھے۔ شاہ غازی الدین حیدر کے عہد میں فن موسیقی کے ماہر تھے اپنی وارفتہ مزاجی کی وجہ سے سڑی حیدری خان مشہور تھے۔ گولہ گنج لکھنؤ میں رہتے تھے۔ بادشاہ کو ان کا گانا سننے کا بے حد اشتیاق تھا مگر اس کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ایک دن شاہ موصوف ہوادار (ایک سواری کا نام) پر سوار دریا کے کنارے سیر کو جا رہے تھے رومی دروازے کے نیچے ہمراہیوں نے دیکھا کہ حیدری خان جا رہے ہیں۔ ایک مصاحب نے بادشاہ سے عرض کیا۔ قبلۂ عالم حیدری خان یہی ہیں۔ بادشاہ نے حکم دیا۔ بلا لاؤ۔ لوگ

خان صاحب کو لے آئے۔ بادشاہ نے کہا۔ میاں حیدری خان۔ کبھی ہمیں اپنا گانا نہیں سناتے۔ بولے۔ جی ہاں کیوں نہ سناؤں گا گر مجھے آپ کا مکان معلوم نہیں ہے۔ یہ سن کر بادشاہ کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ اپنے ساتھ لے گئے۔ محل میں بیٹھ کر گانا سننے لگے بہت محظوظ ہوئے وجد کا عالم طاری ہو گیا بے خود و بے تاب ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کر حیدری خان خاموش ہو گئے۔ بادشاہ نے پھر گانے کو کہا۔ تو بولے یہ تمباکو جو آپ کے پیچ دان (حقے) میں بھرا ہوا ہے اتنا عمدہ ہے کہ سارا کمرہ معطر ہو رہا ہے۔ یہ آپ کس دوکان سے منگواتے ہیں۔ بادشاہ کو یہ ناگوار ہوا۔ لوگوں نے عرض کیا۔ قبلۂ عالم۔ سڑی تو سڑی۔ یہ ابھی تک یہی نہیں سمجھے کہ باتیں کس سے کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد حیدری خان نے گانا شروع کیا۔ بادشاہ نے کہا۔ اگر مجھے صرف خوش کیا اور رُلایا نہیں تو تم کو گومتی (لکھنؤ کے دریا کا نام) میں ڈلوا دوں گا۔ اب حیدری خان کو معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ ہیں۔ کہا۔ حضور اللہ مالک ہے۔ جی توڑ کر گانے لگے۔ خدا کی قدرت تھوڑی ہی دیر میں بادشاہ پر رقت طاری ہو گئی۔ اور خوش ہو کر کہا۔ کیا مانگتے ہو۔ حیدری خان نے کہا۔ مجھے پھر کبھی گانا سننے کے لئے نہ بلوائیے گا۔ بادشاہ نے تعجب سے پوچھا۔ کیوں؟ عرض کیا۔ آپ مجھے مروا ڈالیں گے تو پھر مجھ سا حیدری خان پیدا نہ ہوگا۔ اور آپ مر جائیں گے تو فوراً دوسرا بادشاہ تخت نشین ہو جائے گا۔ اس جواب پر بادشاہ نے منہ پھیر لیا اور یہ موقع پا کر چلے گئے۔

سنہ ۱۸ وبائی۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں دکن سے آئی۔ پانچسو روپیہ

مشاہرہ سرکار سے مقرر ہوا۔ نور کا گلا پایا تھا۔ بے حد خوش آواز تھی۔ جب یہ گاتی تھی تو ایک سنّاٹے کا عالم طاری ہوجاتا تھا اور لوگوں پر وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی خصوصاً حافظ کی جب یہ غزل گاتی تھی ؎

اے نسیمِ سحر آرام گہِ یار کجاست

لوگ بے خود و بے تاب ہوجاتے تھے۔

رجب علی و فضل علی۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں تھے۔ جب بادشاہ ہوا خوری سے واپس آتے تو ایک انگریز تپائی (اسٹول) پر بیٹھ کر بین (بیگ پائپ) بجاتا تھا اور یہ قوال خیال گاتے تھے۔

پنڈت بھیروں دت فن موسیقی کے بڑے ماہر تھے۔ پنڈت جی ڈھول بجانے میں یکتا تھے۔ کپتان سیتلا بخش پنڈت جی کے بڑے قدر داں تھے۔ ایک دن ایک بلبل درخت پر بیٹھی چہک رہی تھی کپتان موصوف نے پنڈت جی سے کہا۔ یہ بلبل کیا کہتی ہے۔ پنڈت جی نے ڈھول منگوا کر تال کے ذریعہ اس کے بول سنادیئے۔ یہ کسی کے شاگرد نہ تھے خود مشق سے کامل استاد ہوگئے تھے۔

محمد حسین خاں عرف محمد۔ عہد شاہی کے طبلہ نواز تھے طبلہ کے اُستاد تھے۔ یہ شعر صاف ان کے طبلہ سے سنائی دیتا تھا۔

؎ تیرے پر سے جھڑنے لگے شرر نہ تڑپ تو بلبلِ زار بس

جلے گا قفس جلے گا قفس جلے گا قفس جلے گا قفس

سُورج۔ چکارا بجانے میں اُستاد تھا۔ اس میں یہ وصف تھا کہ چکارے سے طرح طرح کی آوازیں پیدا کر کے تڑپا دیتا تھا۔

مسٹر مانٹر۔ شاہ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں باکمال موسیقی دان مطرب جرمنی کا رہنے والا تھا۔

مہاراج پرکاش۔ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں مشہور رقاص تھے۔ شنکر کے نباہنے اور کوڑی پر رقص کرتے تھے۔ کوئی دقیقہ علم موسیقی کا ان سے فرو گذاشت نہ ہوتا تھا۔

بندادین و کالکا۔ یہ دونوں درگا پرشاد کے بیٹے تھے اور آخری عہد میں ایسے باکمال گزرے کہ روئے زمین پر ان کا ہمسر نہ تھا۔ دونوں بھائیوں نے خصوصاً بندادین نے رقص کے تمام فنون میں کمال دکھا کر اپنے آپ کو ہر حیثیت سے اُستاد بے بدل ثابت کر دیا۔ بندادین کا گت تا چینا رقص کے اُستادانہ توڑے اور ٹکڑے اصلی صورت میں دکھانا گھنگرو بجانے میں یہ اختیار اور قدرت ظاہر کرنا کہ جتنے گھنگرو چاہیں بجائیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کو پیر کی رگوں پر کس قدر قدرت تھی۔ ایک سو چوراسی (۱۸۴) گھنگرو پاؤں میں باندھ کر رقص کرتے تھے اور اس کے ہر ہر لفظ اور ہر ہر چیز کو بتانا ایسی چیزیں تھیں جن کا بندادین ہی پر خاتمہ ہوا

وہ ایک ایک چیز کو سو سو اداؤں۔ وضعوں۔ نزاکتوں اور دلفریب اشاروں سے بتاتے تھے اور اس میں ایسی نازک خیالی اور جدت طرازی ہوتی تھی کہ دیکھنے والا جانتا نہ ہو تو خاک بھی سمجھ نہیں سکتا۔ ایسا رقص کرتے تھے کہ لوگ ششدر رہ جاتے تھے۔ ایک سناٹے کا عالم طاری ہو جاتا تھا دیکھنے والوں کے دل میں گداز پیدا ہو جاتا تھا۔ ایسے نازک غمزے عشوے اور اشارے رقص میں ہوتے تھے کہ دیکھنے والے پھڑک اُٹھتے تھے۔ یہ معمول تھا کہ بندادین بتاتے اور کالکا پاس کھڑے ہو کے اس کی تشریح کرتے جاتے۔ یاؤں اس نزاکت سے پڑتے تھے کہ متعدد دفعہ تلوار کی باڑھ پہ رقص کیا لیکن کیا مجال جو تلوے میں ذرا سا بھی چرکا آیا ہو۔

نقالی

رقص و سرود کے ساتھ نقالی ہندوستان کا بہت پرانا فن ہے جو راجہ بکرماجیت کے دربار میں حضرت مسیح سے پہلے بھی ترقی پہ تھا۔

بھانڈوں کے لطیفے، نوک جھونک کے فقرے اور نقالی کے عجیب حالات مشہور ہیں۔ جیسی خوبصورتی سے ان لوگوں نے ذی رتبہ لوگوں۔ اُمراء اور رؤساء کو سبق دیئے ہیں اور ان کی لغزشوں پر انہیں متنبہ کیا ہے اور کسی طرح اس وقت ممکن نہ تھا۔

یہ یہاں کے نیشنل سٹائرسٹ تھے۔

قائم علی عہدِ واجدی میں بہت باکمال نقال تھا۔ نواب حضور عالم وزیر محرم میں اس کی سبیل دیکھنے آئے۔ ان کو دیکھتے ہی قائم علی سامنے آیا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ خدا نواب صاحب کو سلامت اور بیگم صاحبہ کو قائم رکھے اتنا سخت فقرہ تھا مگر انعام دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ قائم علی نے ایک مرتبہ یہ کمال دکھایا کہ ساڑھے تین گھنٹے تک طرح طرح کے مُنہ بناتا رہا۔

فنِ طب (۱)

مولوی حکیم عبداللہ کاکوروی کی حذاقت کے بعض واقعات ایسے ہیں جو کشف کے درجہ کے معلوم ہوتے ہیں۔ تشخیص مرض میں نبض و قارورہ دیکھنے کی انہیں حاجت نہ تھی صرف صورت دیکھکر حال معلوم کرتے تھے چنانچہ ایک دن ایک آدمی بظاہر کسی قسم کی بیماری اس کو معلوم نہ ہوتی تھی سامنے سے گزرا دیکھ کر کہنے لگے کہ اس متحرک مُردے کو دیکھو۔ حاضرین نے متعجب ہو کر حال دریافت کیا۔ کہنے لگے کہ اس میں قوت مطلق نہیں رہ گئی ہے عنقریب مرجائے گا چنانچہ ایک ہفتہ کے اندر وہ مرگیا۔

نواب مختار الدولہ بہادر طبا طبائی کو خلل دماغ کا عارضہ تھا۔ ان کے چچا جان سید مصطفوی خاں بغرض علاج نواب مختار الدولہ کو ان کے پاس لائے۔ حکیم صاحب موصوف نے ایسا عمدہ علاج کیا کہ اچھے ہوگئے۔

مولوی حکیم عبد اللہ عہدِ نواب شجاع الدولہ میں تھے۔

علّامہ کنتوری۔ سید غلام حسنین صاحب کنتوری عہدِ شاہی کے تھے پچانوے سال کی عمر میں انتقال کیا۔ بڑے مجتہد عالم اور فنونِ شیخ کے مترجم تھے۔ لاہور میں ایک بار ایک شخص نے امتحاناً قارورہ دکھایا۔ علّامہ نے دیکھکر کہہ دیا کہ یہ بھینس کا پیشاب ہے۔ اگر کسی انسان کا ایسا قارورہ ہو تو اُسے دو گھنٹے کے اندر مرجانا چاہئیے۔

حکیم پناہ علی۔ عہدِ واجدی کے تھے۔ نبض دیکھکر مرض کی بہ صحیح تشخیص کرتے تھے۔ قیافہ شناسی میں ایسا کمال تھا کہ ایک دن یہ اپنے مکان کے آگے کھڑے تھے کہ ایک نوجوان لڑکا اُدھر سے جارہا تھا اس کو بلایا اور پوچھا تم کبوتر بہت اُڑاتے ہو۔ اس نے کہا۔ جی ہاں۔ حکیم صاحب نے کہا کہ خبردار اب قوز ورسے نہ کرنا ورنہ مرجاؤ گے۔ لڑکے نے نہ مانا۔ حسبِ معمول کوٹھے پر چڑھکر کبوتر اُڑائے۔ زور سے قو کی۔ فوراً دم نکل گیا۔

حکیم سیّد ہاشم علی خان موہانی۔ عہدِ شاہی کے تھے۔ میر آغا علی صاحب رئیس جلالی علی گڈھ نے امتحاناً اپنی نبض حکیم صاحب کو دکھائی۔ حکیم صاحب نے گزشتہ آٹھ دن کے کل حالات بتا دیئے اور انہوں نے سب کی تصدیق کی۔ حکیم صاحب موصوف مریض کی صحتیابی کے لئے دن مقرر کردیتے تھے۔

جرّاحی

شیخ عابد حسین عرف عمدو۔ واجد علی عہد کے تھے ایک مرتبہ باہر سے ایک ہندو زمیندار لکھنؤ آئے۔ ان کی ران میں زخم ہو گیا تھا جو کسی طرح اچھا نہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ ٹانگ کاٹی جائے گی زخم کے اندر کیڑے پڑ گئے تھے اگر ٹانگ کاٹی نہ گئی تو مر جائے گا زمیندار ٹانگ کٹوانے پر راضی نہ ہوئے اور عمدو کو بلوایا عمدو نے ڈاکٹر کی موجودگی میں کہا کہ ٹانگ کاٹنے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر سے اور عمدو سے بحث ہو گئی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ تم اچھا نہیں کر سکتے۔ عمدو نے شریفہ کی سوکھی پتیاں جلائیں اور اس کا دھواں زخم کے اندر پہونچایا ادھر دھواں اندر گیا ادھر کیڑے باہر نکلنا شروع ہوئے بہت کیڑے نکلے اس کے بعد ہری شریفہ کی پتیاں ہتیلی پر ملیں اور ان کا عرق زخم پر ٹپکا دیا۔ باقی سب کیڑے نکل گئے۔ چند دنوں میں مرہم لگا کر زخم بھر دیا۔ زمیندار نے عمدو کو بہت انعام دیا اور ڈاکٹر صاحب جرّاح کے کمال کے قائل ہو گئے۔

مولوی۔ اسی عہد کے تھے۔ مفتی گنج میں رہتے تھے۔ ایک رئیس کے لڑکے کی آنکھ پر ناسور ہو گیا تھا۔ مدّتوں ڈاکٹروں حکیموں کا علاج ہوتا رہا۔ کوئی نتیجہ نہ نکلا آخر کار مولوی کو دکھایا گیا۔ تیرھویں دن بالکل اچھا کر دیا۔ اور مدت العمر کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

چربہ یا نقل

شاہ نصیر الدین حیدر کے عہد میں ایک مصنوعی جھیل تھی جو تمام باغ کو چھائے ہوئے تھی۔ اس کے بیچوں بیچ ایک بہت ہی خوبصورت بارہ دری بنی تھی جو کسی کنارے سے متعلق نہ تھی۔ اس بارہ دری میں باہر کی جانب نہایت نفیس رنگ آمیزی اور گل کاری کی ہوئی تھی اور اس کی وضع بڑی دل کش تھی۔ اس جھیل کا پانی ایسا صاف شفاف تھا کہ تہہ کی سب چیزیں دکھائی دیتی تھیں۔ اس بارہ دری میں بجرے پر سوار ہو کر جاتے تھے۔ بارہ دری کے بڑے کمروں میں سے ایک کمرے میں ایک میز پر پورا نمونہ محلات شاہی کا بنا ہوا رکھا تھا جس میں محلات کے ہر ہر جزو کا نہایت باریک بینی اور دیدہ ریزی کے ساتھ چربہ اُتارا گیا تھا اور رنگ ایسے ٹھیک ٹھیک دیے گئے تھے کہ گویا ہو بہو تصویر کھینچ دی۔ اسی نقشہ میں اس بارہ دری کی نقل جو ایک اخروٹ سے بڑی نہ تھی۔ اس خوبی سے اُتاری تھی کہ اس کی جزئی جزئی تفصیل وار تمام کمروں کے دکھلائی گئی تھی کوئی چیز چھوٹی نہ تھی۔ (شباب لکھنؤ)

شیخ نجابت علی شاہ۔ یہ بزرگ نواب سعادت علی خان کے عہد میں فرنگی محل میں رہتے تھے۔ ایک بار یہ اتفاق ہوا کہ نواب صاحب نے اپنے آب بردار رضو کو بلا کے پانچ سو روپے دیے اور اس سے پوچھا۔ بتاؤ پیر نے تم کو یہ روپیہ کیوں دیا۔ کیا تم نے کوئی

سه جز رسی کی وجہ سے بہت ہی کم کسی کو انعام و اکرام کی سرفرازی نصیب ہوتی تھی۔ ۱۲

عمل پڑھوایا ہے۔ آب بردار نے عرض کیا کہ فرنگی محل میں فلاں بزرگ سے میں نے کہا تھا کہ میری بیٹی کی شادی کا کوئی ساماں نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ غلام نے کچھ نہیں کیا۔ یہ سن کر نواب صاحب خاموش ہو گئے اور شب کو اپنی مہر اور قلم دان شیخ صاحب موصوف کے پاس بھجوایا کہ یہ چیزیں موجود ہیں جسکو چاہیے بادشاہ بنائیے (انوار رزاقیہ)

اسلحہ سازی (۲)

مسیو سون اور مسیو بیڈوز۔ یہ دونوں فرانسیسی نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ ان کے اہتمام میں اسلحہ اور توپیں بندوقیں تیار ہوتی تھیں۔ ایسی توپیں بھی بنتی تھیں جن کا گولہ چوبیس میل جاتا تھا۔ شاہی عہد کے آخری دور میں ایسے کاریگر بھی تھے جو ہوبہو ولایتی بندوقوں کی نقل اتارنے لگے تھے۔ یہی دونوں سپاہیوں کو فوجی تعلیم دیتے تھے۔

سُناری

نواب ملکہ جہاں۔ ملکہ ثانی محمد علی شاہ کے پاس ایک نہایت نفیس اور خوش نما نقرئی حقہ لکھنؤ کے دستکار کا بنایا ہوا تھا۔ اس کا وزن ستّرہ سو تولے تھا اور اس کی ہر شئے چاندی کی بنی ہوئی تھی ایک چاندی کی چوکی تھی اس پر حقہ رکھا جاتا تھا جو کہ چاروں کونوں پر ایک ایک

پتلی تھی اور بیچ میں ایک بڑی پتلی تھی جس کے ہاتھ میں حقہ تھا۔ اسی پتلی سے آم کا درخت نکالا تھا۔ درخت میں کیریاں بنائی تھیں جن پر مینا کیا ہوا تھا۔ درخت پر ایک چڑیا بیٹھی تھی۔ پتلی کے ہاتھ میں جب نے دی جاتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ پتلی حقہ پلا رہی ہے۔ جب حقہ پیا جاتا تھا تو پتلی یکے بعد دیگرے اپنے پیر اٹھاتی تھی اور چڑیا اپنی گردن ادھر ادھر پھرا کر چوں چوں بولتی تھی اور اپنے بازوؤں کو کھول کر پر ہلاتی تھی۔

مسٹر فنڈل کیری ڈپٹی کمشنر لکھنؤ نے اس حقہ کو ملکہ جہاں سے مستعار لے کر لندن کی نمائش میں بھیجا تھا۔ اس حقہ کی تعریف میں وہاں سے ایک سارٹیفکٹ آیا تھا۔ کہ ہندوستان سے اس سے زیادہ نادر چیز نمائش میں نہیں آئی۔

(۲) ملکہ موصوفہ کے پاس ایک پازیب نہایت عمدہ صراحی دار موتیوں کی تھی جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ کاریگر نے اس میں یہ صنعت دکھائی تھی کہ جب پازیب کے پھول کو کھول دیا جاتا اور گچھے کو اوپر کھینچا جاتا تو ٹخنے سے گھٹنے تک جالی دار جراب کی طرح پنڈلی کے چاروں طرف لپٹ جاتی اور جب بیچ کی کیل نکال دی جاتی تو خودبخود پھسل کر ٹخنے پر آ کر گچھے کی طرح بن جاتی۔

بکاؤلی

یا کھانا پکانے کا فن جس قدر شاہان اودھ کے زمانے میں عروج

بہم پہنچا شائد ہی کسی عہد میں اتنی ترقی کسی سرزمین پر اس فن کو نصیب ہوئی ہو۔ جس قدر کھانے شاہانِ اودھ کے عہد تک ایجاد ہو چکے تھے ان سب کے بہتر سے بہتر پکانے والے شاہی عہد میں گزرے امراء رؤساء اور بادشاہ قدر دان تھے۔ نفیس لذیذ خوش نما اور مقوی کھانے پکانے اور ایجاد کرنے میں ہزار ہا دماغ اور طبیعتیں مصروف ہوتی تھیں۔ جس کا یہ نتیجہ تھا کہ نئے نئے کھانے ایجاد ہوتے تھے۔ اودھ کے پُر تکلف اور انواع انواع کے کھانوں کے نام اتنے ہیں کہ کم لوگوں نے سُنے ہوں گے۔ پھر ہر ایک قسم کے کھانوں کی پچاسوں قسمیں ہوتی تھیں۔ اِسی طرح بہت اقسام کبابوں کی ہیں۔ یہ سب عوام اور اہل کمال کی پرورش کے حیلے تھے جو بظاہر اِس شان سے رونما ہوتے تھے۔ بطور مثال چند کھانوں کے نام۔ انار دانہ پلاؤ۔ نورتن پلاؤ۔ موتی پلاؤ۔ نور پلاؤ۔ کوکو پلاؤ چنبیلی پلاؤ۔ گلزار پلاؤ۔ اناناس پلاؤ وغیرہ۔ کباب گل۔ کباب سنگ کباب خوش نمک۔ کباب ورق وغیرہ۔

انار دانہ پلاؤ میں ہر چاول آدھا یاقوت کی طرح سرخ ہوتا تھا اور آدھا سفید لیکن اس پلاؤ میں مثل انار کے دانوں کے شیشہ کی طرح چمک ہوتی تھی دسترخوان پر معلوم ہوتا تھا کہ پلیٹ میں ابلق رنگ کے جواہرات رکھے ہیں۔ یہی کیفیت نورتن پلاؤ کی ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سڈول اور آبدار موتی چاولوں میں دم کر دیئے ہیں۔ ایک رکابدار نے پلاؤ کی تیاری میں یہ صفت دکھائی کہ گوشت کی چھوٹی چھوٹی چڑیاں بنا کے اس احتیاط سے پکایا کہ صورت نہ بگڑنے پائے۔ چاولوں کی صورت دانے کی کر دی معلوم ہوتا تھا کہ مہمانوں کے سامنے پلیٹ میں چڑیاں بیٹھی دانہ چگ رہی ہیں۔

ایک رکابدار نے یہ صنعت دکھائی کہ دستر خوان پر بڑے بڑے سیر سیر بھر کے انڈے اُبلے اور تلے ہوئے پیش کئے جس میں سفیدی اور زردی اُسی نسبت سے قائم تھی جو معمولی انڈوں میں ہوتی ہے ایک باورچی نے خشخاش کے دانوں پر چاروں طرف کٹھل (ایک بڑا پھل ہے) کے ایسے خار پیدا کئے اور خاص ترکیب سے پکا کر دستر خوان پر پیش کیا۔ ایک رکابدار نے بادام کا سالن پکایا جو بعینہٖ سیم کے بیجوں کے مثل تھا لیکن مزے اور لطافت میں اُس سے بڑھا ہوا تھا۔

نواب شجاع الدولہ اور ان کے پسر نواب آصف الدولہ کے باورچی خانہ کا صرفہ ساٹھ سے لے کر ستّر ہزار روپے ماہوار کا تھا اور ہزاروں روپیہ ماہوار تنخواہیں اِس فن کے کاملین کو دی جاتی تھیں۔ کئی ہزار روپیہ روز کا خرچ شاہ نصیر الدین حیدر اور واجد علی شاہ کے باورچی خانہ کا تھا۔

نواب سالار جنگ (برادر نسبتی نواب شجاع الدولہ) کا باورچی خاص نواب صاحب کے لئے ایسا بھاری پلاؤ پکاتا تھا کہ سوائے ان کے کسی کو ہضم نہیں ہو سکتا تھا بوجہ با کمال ہونے کے اُسکی تنخواہ بارہ سو روپیہ ماہوار تھی۔ یہ باورچی عہد نواب شجاع الدولہ میں فیض آباد میں تھا

نواب آصف الدولہ کے سامنے ایک نیا باورچی پیش ہوا۔ پوچھا کیا پکاتے ہو۔ عرض کیا صرف ماش کی دال۔ پوچھا کیا تنخواہ لو گے جواب دیا۔ پانچسو ۵۰۰ روپے۔ نواب نے نوکر رکھ لیا۔ باورچی نے کہا۔ میری ۲ دو شرطیں ہیں۔ پوچھا۔ وہ کیا۔ کہا۔ حضور دال کی فرمائش ایک روز پہلے حکم دیں اور جب تیار ہو جائے تو اُسی وقت نوش فرمالیں۔

نواب نے منظور کیا۔ چند مہینے کے بعد دال پکانے کا حکم ہوا۔ تیاری کے بعد باورچی نے نواب کو اطلاع دی انہوں نے کہا اچھا دسترخوان بچھواؤ میں آتا ہوں۔ دسترخوان بچھا مگر نواب باتیں کرتے رہے۔ باورچی نے جا کے پھر یاد دہانی کی کہ خاصہ تیار ہے۔ نواب پھر بھی نہیں آئے۔ اس نے سہ بارہ یاد دلایا اس پر بھی نواب نہ آئے تو باورچی نے دال کی پتیلی ایک پرانے سوکھے درخت کی جڑ میں اُنڈیل دی اور استعفا دے کر چلا گیا۔ نواب کو افسوس ہوا۔ تلاش کروایا۔ پتہ نہ لگا۔ چند روز کے بعد دیکھا گیا تو جس درخت کی جڑ میں دال ڈالی گئی تھی وہ سرسبز ہونے لگا تھا۔

نواب سعادت علی خان کا باورچی چاولوں کی کھچڑی پکاتا تھا جو بے مثل ہوتی تھی اور شاہی دسترخوان کی رونق ہوتی تھی۔ اُمرا و رؤسا اس کے ایک لقمہ کی تمنا رکھتے تھے۔

نواب ابوالقاسم خان۔ عہدِ سعادتی میں نہایت شوقین رئیس تھے جو خود بے مثل پلاؤ پکاتے تھے۔ چوبیس ۲۴ سیر گوشت کی یخنی تیار کر کے مقطر کرتے تھے اور اس میں چاول دم کئے جاتے اور کھانے میں یہ کیفیت ہوتی تھی کہ لقمہ منہ میں رکھتے ہی یہ معلوم ہوتا تھا کہ چاول خود ہی گھل کر حلق میں اُتر گئے۔ لطافت کا یہ عالم کہ کیا مجال جو کسی قسم کی گرانی محسوس ہو۔

شاہ غازی الدین حیدر۔ کھانوں کے بڑے شوقین تھے۔ انہوں نے طرح طرح کے پلاؤ اور بہت سے کھانے ایجاد کئے مثلاً شب دیگ۔ نان آفتاب اور بڑی روٹی جو میوے اور قند سے تیار کی جاتی تھی اور جس کا وزن دو من ہوتا تھا۔ ان کا باورچی ان کے لئے چھ پراٹھے روز پکاتا تھا اور تیس ۳۰ سیر گھی لیا کرتا تھا۔ نواب معتمد الدولہ آغا میر (وزیر) کے حکم

سے گھی کم کر کے پانچ سیر کر دیا گیا۔ باورچی نے اتنے ہی گھی میں پراٹھے
پکا دیئے۔ بادشاہ نے باورچی کو بلوا کر دریافت کیا۔ یہ آج کیسے پراٹھے
پکائے۔ اُس نے عرض کیا۔ جیسے نواب معتمد الدولہ نے حکم دیا۔ معتمد الدولہ
بلائے گئے۔ بادشاہ ان پر ناراض ہوئے۔

شاہ غازی الدین حیدر کے زمانہ میں ایک سالار جنگ رئیس تھے ان کے
دسترخوان پر بیسوں طرح کے پلاؤ ہوتے تھے یہاں تک کہ وہ نواب حسین علی
خان چاول والے مشہور ہو گئے تھے۔ اس درجہ ان کو پلاؤ کا شوق تھا کہ
رؤسا و امراء و عمائدین میں کوئی ان سے سبقت نہ لے گیا۔

علی بخش لکھنوی۔ شاہ نصیر الدین حیدر کے وقت میں شاہی باورچی خانہ
میں ملازم ہوئے۔ زمانہ امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ میں بڑی شہرت
حاصل کی۔ کھانے بے مثل پکاتے تھے۔ بعد انتزاعِ سلطنت ہز ہائینس
نواب محسن الدولہ بہادر کے ملازم ہوئے پھر پرنس ممتاز الدولہ بہادر
کے ملازم ہوئے۔ ایک دن حامد علی خان صاحب بیرسٹر نے ان سے پوچھا
کہ اروی کتنی طرح پکا سکتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ سر دست یہ عرض کر سکتا
ہوں کہ سال بھر اروی پکا سکتا ہوں اور ہر دفعہ نئی ترکیب سے۔
ننانوے ۹۹ سال کی عمر میں یکم اکتوبر ۱۹۰۲ء میں علی بخش نے لکھنؤ میں انتقال کیا۔

ایک باورچی۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں پستہ بادام کی کھچڑی پکاتا
تھا۔ بادام کے سڈول اور صاف ستھرے چاول بناتا تھا پستہ کی دال
بناتا تھا اور اس خوبی سے پکاتا تھا کہ نہایت نفیس پھریری ماش کی
کھچڑی معلوم ہوتی تھی۔ کھانے میں ایسی لذت کہ عمر بھر زبان مزہ یاد رکھے۔

عالم علی۔ پرنس خورم بخت یحییٰ علی خان کے ملازم تھے۔ مسلّم مچھلی ایسی

بے مثل پکاتے تھے کہ تمام رئیسوں میں مشہور تھی۔ دوسرے باورچیوں نے ہزار کوشش کی مگر ویسی نہ پکا سکے۔

پیر علی لکھنوی ۔ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں نواب قدسیہ بیگم کے ملازم ہوئے۔ انہوں نے پھولے ہوئے سموسے سب سے پہلے ایجاد کئے جس کو توڑتے ہی لال اُڑ کر اُڑ جاتے تھے۔ سلطانی دال ایجاد کی جس میں مشک و عنبر کی خوشبو آتی تھی اور جس کے سامنے اچھے اچھے کھانے، ہیچ معلوم ہوتے تھے۔ دال بگھارتے وقت دو اشرفیاں گھی میں ڈالتے تھے جو ڈالتے ہی گھل جاتی تھیں۔ یہ مٹھائی کا انار بھی بناتے تھے جس میں اوپر کا چھلکا اندر کے دانے ان کی ترتیب اور ان کے بیچ کے پردے سب اصلی معلوم ہوتے تھے دانوں کی گٹھلیاں بادام کی ہوتی تھیں۔ ناسپاتی کے عرق کے دانے ہوتے تھے۔ دانوں کے بیچ کے پردے اور اوپر کا چھلکا شکر کے ہوتے تھے۔ غدر کے بعد پیر علی حضور نظام کے ملازم ہو گئے تھے

شیخ اکرام علی ۔ اشرفیوں اور روپیوں کا مربہ بناتے اچھے تیار ہونے پر نقش اور حروف مٹتے نہ تھے۔ جس عہد اور سنہ کا سکہ ہوتا تھا وہ پڑھ لیا جاتا تھا۔ کھانے میں کسی قسم کی گرانی معلوم نہ ہوتی تھی۔ نہ وہ کشتہ کا کام دیتا تھا ناگپور اور کلکتہ کی نمائش جو سنہ ۱۸۸۱ء میں ہوئی تھی اور نمائش لکھنؤ میں تمغے اور سرٹیفکٹ ملے تھے جو ان کے پوتے کے پاس موجود ہیں۔ کلکتہ کی نمائش میں اُبلے ہوئے انڈے کی زردی پر کارچوب بنایا۔ اچاری میں مع شیرہ رکھکر بھیجا۔

وہاں کھایا گیا اور نہائت لذیذ ثابت ہوا۔ دوسرا امر یہ آم کی قاشوں کا تھا۔ ایک قاش پر سوئی سے یہ مصرعہ لکھا اور دوسری قاش پر چاندی سے یہ شعر لکھا ۔ زبان شیریں سے حکام ملک گیش :: لیا تدبیر سے سارا جہاں ہے :: اس قاش کو دیکھ کر انگریز پھڑک اٹھے اور بہت خوش ہوئے۔ ٭

۱۸۹۶ء ۹۵ ۱۳ھ میں شیخ اکرام علی نے لکھنؤ میں انتقال کیا۔

شیخ حیدر بخش۔ عہد واجدی کے آخری باکمالوں میں تھے۔ انہوں نے متعدد بار دعوتوں کے موقع پر کباب پراٹھے قورمہ پلاؤ اور کئی طرح کے سالن مونگ کی دال کے تیار کر کے دسترخوان پر پیش کئے۔ جن کا ذائقہ بالکل اصلی کھانوں کا تھا اور کوئی بھی تمیز نہ کر سکا کہ یہ مونگ کی دال سے تیار کئے گئے ہیں۔ انار پلاؤ اور شریفہ پلاؤ پکاتے تھے۔ ان کے بنائے ہوئے شریفہ اور انار اصلی انار اور شریفوں میں کئی بار ملا کے رکھے گئے۔ کوئی پہچان نہ سکا۔ یہ تین سو ساٹھ ۳۶۰ قسم کی روٹی پکا جانتے تھے۔ ہاتھی کان روٹی ایسی پکاتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھی کا کان کٹا ہوا رکھا ہے۔ اور کھانے میں کسی قسم کی گرانی نہیں ہوتی تھی۔

پچانوے ۹۵ سال کی عمر میں ۱۹۳۴ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

شیخ حسین علی دہلوی۔ پرنس مرزا آسمان قدر بہادر تیموری کے باورچی تھے۔ شاہزادے موصوف عہد واجدی میں بنارس سے لکھنؤ آئے۔ واجد علی شاہ نے ان کی دعوت کی دسترخوان

٭ شیخ اکرام علی ایک ایسی روٹی پکاتے تھے جس میں کئی مزے ہوتے تھے یعنی ایک طرف سے کھائے تو میٹھی دوسری طرف سے کھائے تو نمکین تیسری طرف سے معمولی روکھی روٹی کا ذائقہ چوتھی طرف سے سلونی۔ یہ بالائی کی گلوری ایسی بناتے تھے [illegible] اوپر کی پرت کی گلوری بناتے تھے اور پستہ کی کیس لگاتے تھے ایسا رنگ ہوتا تھا کہ بالکل پان معلوم ہوتا تھا۔

پر ایک مربّہ لا کے رکھا گیا جو صورت میں نہایت نفیس اور مرغوب معلوم ہوتا تھا۔ یہ مربّہ واجد علی شاہ کے باورچی کا تیار کیا ہوا تھا۔ جب مرزا آسمان قدر نے اس کا ایک لقمہ کھایا تو چکرا گئے اس لئے کہ وہ مربّہ نہ تھا بلکہ گوشت کا نمکین قورمہ تھا۔ آسمان قدر کو ندامت ہوئی اور بادشاہ خوش ہوئے۔ چند دن کے بعد شہزادہ صاحب نے واجد علی شاہ کی دعوت کی۔ بادشاہ کو یہ خیال تھا کہ انہیں بھی دھوکا دیا جائے گا مگر ہوشیاری پر بھی دھوکا کھا گئے اس لئے کہ شیخ حسین علی نے یہ کمال کیا تھا کہ دسترخوان پر صدہا انواع اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے کباب پراٹھے قورمہ پلاؤ شیرمالیں وغیرہ مگر واجد علی شاہ نے جس چیز کو چکھا وہ شکر کی بنی تھی۔ سالن تھے تو شکر کے کباب پراٹھے شیرمال روٹیاں چاول غرض کہ سب کھانے شکر کے تھے یہاں تک کہ ظروف دسترخوان سلفچی آفتابہ تک شکر کے تھے۔ بادشاہ گھبرا گھبرا کر ایک ایک چیز پر ہاتھ ڈالتے تھے اور دھوکہ پر دھوکہ کھاتے تھے۔

حسین علی لکھنؤ میں دفن ہیں۔

مرزا کبابیہ۔ عہد شاہی میں محلہ نبہرہ میں عتیق اللہ کے امام باڑہ کے متصل اس کی دوکان تھی۔ ایسے لذیذ اور معطر کباب بناتا تھا کہ شاہی مطبخ میں بھی ایسے کباب نہ ہوتے تھے۔ بکری کے گوشت کا قیمہ دن بھر میں درست کر کے شام کو وہ ٹکیہ کے کباب فروخت کرتا تھا۔ چھٹانک بھر کا کباب ہوتا تھا اور ایک پیسہ

قیمت ہوتی تھی۔ زعفران اور تازہ گھی ڈالنا تھا۔

شہزادہ عظیم الشان ۔ نے ایک شادی کے موقع پر سمدھی ملاپ کی دعوت کی تھی جس میں واجد علی شاہ بھی شریک ہوئے۔ اس دعوت میں علاوہ دیگر کھانوں کے دسترخوان پر ستر قسم کے نمکین اور میٹھے چاول تھے۔

روشن الدولہ ۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ کے وزیر تھے۔ ان کا ایک باورچی کچے بھٹوں کے گچھے اس خوبی سے تراشتا تھا کہ کہیں سے ٹوٹتے نہ تھے اور ان کا رایتہ ایسا عمدہ بناتا تھا کہ جو چکھتا عش عش کر جاتا۔

شیخ فرحت اللہ ۔ واجدی عہد کے تھے۔ لقمیاں بے مثل بناتے تھے۔ آم کے پراٹھے۔ دودھ کی روٹی۔ ہوائی روٹی خوب پکاتے تھے۔ ایک بار لکھنؤ کے ایک معزز شخص سے گورنر نے فرمائش کی کہ ہم نے لکھنؤ کے باورچیوں کی بہت تعریف سنی ہے مگر ان کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی کوئی چیز نہیں کھائی۔ ان صاحب نے فرحت اللہ سے کہا کہ لاٹ صاحب کے لئے کوئی چیز تیار کرو۔ فرحت اللہ نے دو بڑی بڑی پوریاں خوب پھولی ہوئی پکائیں دونوں کو علٰحدہ علٰحدہ ایک ایک قاب میں رکھا۔ ایک قاب لاٹ صاحب کے سامنے میز پر رکھی اور دوسری لیڈی صاحبہ کے سامنے۔ لاٹ صاحب جیسے ہی پوری کاٹنے لگے اور پوری کا چھلکا کٹا۔ پوری کی خلا سے ایک بندر کا بچہ قیں قیں

کرتا ہوا نکل کے بھاگا۔ دوسری پوری سیم صاحبہ تراشنے لگیں تو اس میں سے لال نکل کر چوں چوں کرتے اُڑ گئے۔ گورنر نے فرحت اللہ کو سو روپیہ اور شالی رومال انعام دیا۔

فرحت اللہ کا ۱۹۲۱ء میں انتقال ہوا۔

شیخ فدا علی لکھنوی۔ عہد واجدی کے رکابدار تھے۔ انگریزی عہد میں انہوں نے ایک کنول (فانوس) بنا کر گورنر کو پیش کیا اور اس میں شمع لگا کر روشن کر دیا۔ روشنی بہت صاف تھی گورنر نے کہا تم نے شیشہ کو صفائی سے ڈھال کر بنایا ہے اور کوئی بات اس میں قابلِ تعریف نہیں۔ فدا علی نے کنول کا کنگارا چٹکی سے توڑا اور گورنر سے کہا کہ حضور اسے نوش فرمائیں۔ گورنر نے کہا۔ ہم شیشہ نہیں کھاتے۔ خود فدا علی نے چبا کر کھایا اور دیگر حضرات کو کھلایا اور گورنر سے کہا کہ کنول حضور کی نذر ہے۔ یہ پورا کنول مصری کا بنا ہوا تھا۔ گورنر نے کہا۔ کمال کی حد کر دی۔ اور انعام دیا۔

سید علی اوسط صاحب کا بیان ہے کہ خاندانی رؤسائے لکھنؤ میں سے نواب علی نقی خاں نے ایک روز مجھ سے کہا کہ رات کا کھانا ذرا انتظار کر کے کھائیے گا میں کچھ بھیجوں گا۔ رات کو حسب وعدہ کھانے کے وقت ان کا آدمی ایک خوان لے کر آیا۔ میں نے دفورِ شوق سے سامنے منگوا کر کھولا تو اس میں صرف ایک پلیٹ تھی جس میں ایک کچا کدو رکھا ہوا تھا جسے دیکھ کر طبیعت نہایت منغض ہوئی انتہائے یاس میں میں نے ماما (ملازمہ) سے کہا اسے لے جا کر رکھو کل پکا لینا۔

شہزادہ کے آدمی نے ہنس کر کہا۔ اسے کاٹ کر یونہی نوش فرمائیے پکانے کی ضرورت نہیں۔ اب میں نے جو اسے کاٹا تو عجیب لذیذ اور مزے کی چیز معلوم ہوئی جس سے زبان آشنا نہ تھی۔

واجد علی شاہ کے آخری عہد کا رکابدار۔ جب بادشاہ مٹیا برج کلکتہ میں رونق افروز تھے تو اس رکابدار نے باغ میں نارنگی کے درخت میں چند نارنگیوں میں اس کمال کے ساتھ شیرہ اتار دیا تھا کہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ جب بادشاہ نے نارنگی توڑی اور رکابدار نے چھیل کر قاش پیش کی اور بادشاہ نے نوش کی تو لب بند ھنے لگے۔ سونگھنے میں اس نارنگی سے بھینی بھینی نارنگی کی خوشبو بھی آتی تھی۔ نارنگیاں ذائقہ میں اصلی نارنگی کی طرح تھیں رنگ روپ اور رس کسی بات میں فرق نہ تھا نہ کہیں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کیونکر نارنگی میں شیرہ اتارا ہے کوئی نشان تک نہ تھا۔

"ذکر میر" ظفرنامہ ــــــ "گزشتہ لکھنؤ" حیات

قنّادی

حُسینی۔ عہدِ نصیری میں حلوا سوہن پپڑی جبشی۔ دودھیا کا بے مثل قنّاد تھا۔

نُورا۔ اسی عہد میں مثل بلور کے صاف بالائی بناتا تھا جو بہت شیریں ہوتی تھی۔

تفریحی فنون

پان کی گلوری

اہل لکھنؤ کی نفاست مزاج کی وجہ سے یہاں کے تنبولیوں نے صنعتی اصول پر پانوں کو یہ ترقی دی کہ یہاں کے پان ہندوستان میں سب جگہ سے بڑھ گئے۔ پانوں کو مہینوں زمین میں دفن کر کے ان کا کچا پن دور کیا جاتا تھا اور جو زمین سے نکالے پر بسنتی رنگ کے ہو جاتے تھے اور بیگمی پان کہلاتے تھے۔ چونے کو خاص طور پر صاف کیا جاتا تھا۔ اور حل کی ہوئی زعفران ملائی جاتی تھی۔ کتھے کو دلکھ بھرے ہوئے طباق پر کپڑے پہ پھیلا کر پکھٹا پن دور کیا جاتا تھا خشک ہونے پر عرق کیوڑہ میں بھگویا جاتا تھا۔ ڈلی (چھالیہ) کو نفیس کاٹنے میں اہل لکھنؤ نے کافی درجہ ترقی کی۔ شاہ نصیر الدین حیدر کے لئے گز بھر کی لمبی گلوری بنتی تھی اور لطف یہ تھا کہ جو پان سے کاٹ کر کھائی جائے مصالحہ برابر ہوتا تھا۔

طوطے اڑانا

میر محمد علی لکھنوی۔ محمد علی شاہ کے عہد میں تھے۔ انہوں نے طوطوں سے کبوتروں کا کام لیا۔ اور بڑا کمال حاصل کیا۔ طوطا فطرتاً بے وفا جانور ہوتا ہے۔ پنجرے سے نکلتے ہی اڑ جاتا ہے۔ لیکن

خدا جانے میر صاحب نے کونسا افسوں دم کر دیا تھا کہ طوطے کی فطرت بدل دی تھی۔ یہ روز حسین آباد میں آکر دس بارہ طوطوں کی ٹکڑی اڑاتے تھے اور کیا مجال تھی کہ میر صاحب سیٹی بجا کر آ گرہیں اور وہ آسمان سے اتر کر سیدھے پنجرے میں نہ جائیں۔ ایک طوطا جلتی ہوئی بتیسی گھماتا تھا۔

بیا کی تعلیم

اسی عہد میں ایک شخص نے بیا کو ایسا سکھایا تھا کہ اُس سے توپ "چھوڑ" واتا تھا۔ اور اسی سے نیم کی پتی یا کوڑی اچھال کر منگواتا تھا۔

"فسانہ عبرت"

داستان گوئی (۳)

داستان گوئی اودھ کی سلطنت کے مشہور فنون میں سے ہے۔ اس کے چار فن ہیں۔ رزم۔ بزم۔ حسن۔ عشق و عیاری۔ بظاہر اسکو تضیع اوقات کا ضمیمہ خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ غلط فہمی ہے۔ یہ فن بہت مفید فنون تفریحی میں تھا وقت دلچسپی اور لطف سے کٹ جانے کے علاوہ اس سے جو بڑا فائدہ تھا وہ یہ تھا کہ باتوں باتوں میں ایسی جگہی باتیں اور طرح طرح کے تجربہ کی باتیں سنا دی جاتی تھیں جس سے انسانی زندگی اور طرز معاشرت میں بڑی مدد ملتی تھی اور بچوں میں داستان گوئی کے واقعات شجاعوں کے بہادری کا

سے کارناموں سے جنگی روح پیدا ہوتی تھی۔

آصفی عہد سے اخیر زمانہ تک بہت سے نامور داستان گو گزرے ہیں ان میں۔ میر نواب۔ میر انور۔ منشی انبا پرشاد رسا کی زیادہ شہرت ہوئی۔ عہد شاہی کے آخری دور میں داروغہ غلام عباس مشہور داستان گو تھے۔ فن حسن و عیاری کو ایسا بیان کرتے کہ شاہد و بانکے حسن کا نقشہ کھینچتے تو معلوم ہوتا کہ انہیں کا چہرہ حسن کی تصویر ہے اور بہت خوبصورت نظر آنے لگتے۔

فیض آباد

شاہی زمانہ میں ایسے صدہا باکمال تھے جن کو شہر کے ترتیب دینے اور آراستہ کرنے میں ید طولیٰ تھا اس وقت بھی شہر خودرو درختوں کی طرح صفحۂ ارض پر پیدا نہیں ہوئے بلکہ یہ بھی ایک خاص فن تھا جس کے ماہر اس وقت بڑی بڑی تنخواہیں پاتے تھے۔ نواب شجاع الدولہ نے جب دار السلطنت کی حیثیت سے فیض آباد کو آراستہ کیا تو اس کے لئے خاص اہتمام کیا گیا اور خاص خاص ماہرین فن کے کمالات شہر کی تیاری پر تصدق ہوئے۔ از سر نو شہر پناہ کی تعمیر ہوئی جو اب قلعہ کہلاتا ہے اس کے گرد ہر طرف دو دو میل کا میدان چھوڑ دیا گیا جس کے گرد خندق بنا کے قلعہ بندی کی گئی۔ نہر بنا اور چوک بازار مرتب ہوا۔ سڑک قلعہ کے جنوبی پھاٹک سے شروع ہو کر الہ آباد والی سڑک سے ملا دی گئی اتنی کشادہ کہ برابر اس پر

دس چھکڑے آسانی سے گزر سکتے تھے۔ جوانی شہر میں دو سبزہ زار شکارگاہ قرار دیے گئے۔ خاص فیض آباد میں تین ایسے نزہت بخش باغ تھے کہ ان میں عوام۔ رؤساء۔ امراء سیر و تفریح کریں۔
انگوری باغ۔ موتی باغ۔ لال باغ۔

ان میں نہایت نفاست سے چمن بندی کی گئی تھی اور ہر طرح کے نازک خوش رنگ خوشبودار اور دلفریب پھول قرینے سے لگائے گئے تھے۔ لال باغ کی جانفزائی کی شہرت سنکر شاہ عالم بادشاہ دہلی اس کی سیر کے شوق میں فیض آباد آئے تھے۔

یہاں کی شاہی عمارتیں اور باغ وغیرہ سب معدوم ہو گئے البتہ نواب شجاع الدولہ اور نواب بہو بیگم کے مقبرے عظمت رفتہ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ دونوں مقبرے نہایت عالیشان ہیں۔ اندر قیمتی سامان سے آراستہ ہیں۔ قبروں پر سرخ و سبز مخمل کی زرکار چادریں اور شامیانے نقرئی ستونوں پر استادہ ہیں۔ قبروں کے چاروں طرف نقرئی جنگلہ ہے۔

نواب اور بیگم کی برسیاں دھوم دھام اور محرم میں شیرینی تقسیم ہوتی ہے دیکھ بھال اور روشنی وغیرہ وقف نواب بہو بیگم کے زیر انتظام ہے۔ اطراف میں گلاب باڑی کے روح پرور چمن ہیں۔ مقبروں کو دیکھنے اکثر باہر کے لوگ آتے رہتے ہیں۔

ترپولیا اور چوک، بازار کے وسط میں تین راستوں کا ایک بڑا اور بلند پھاٹک ہے۔ اس کے پہلو میں دوکانیں تھیں۔ ہیں سرور کی چائے ملتی تھی، نخاس میں دورویہ دوکانیں اور پھاٹک باقی ہے۔

لکھنؤ کی شاہی یادگاریں

انگریزی عملداری میں لکھنؤ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ شاہی زمانہ کا لکھنؤ کچھ اور ہی تھا۔ گنتی کی چند شاہراہیں اور بازار باقی ہیں جو اپنی اصلی حالت پر نہیں ہیں۔

بے شمار محلے اپنے قدیم ناموں کے ساتھ آباد ہیں لیکن ان کا بھی نقشہ بدل گیا ہے اور بعض مقامات تو ایسے ہیں کہ جن کا نام تو ہے لیکن نشان کچھ بھی نہیں ہے۔

لکھنؤ کی وہ تمام شاہی عمارتیں اور باغ جن سے یہاں کے اہل ہنر کا سراغ ملتا تھا وہ سب مٹ گئیں جو باقی تھیں وہ غدر میں تباہ و برباد ہو گئیں ان کے مٹنے سے ان کے بنانے والوں کا نام بھی مٹ گیا۔ بعض ایسی عمارتیں باقی رہ گئی ہیں جن کو شاہی عمارت کہتے شرم آتی ہے۔ مثلاً مقبرہ جناب عالیہ۔ امام باڑہ ملکہ زمانیہ۔ مدفن و کربلا شاہ نصیر الدین حیدر۔ چوکھی۔ حسینی بازار کا پھاٹک۔ سبطین آباد وغیرہ۔ بادشاہ باغ۔ ولایتی باغ۔ عیش باغ۔ عالم باغ۔ چار باغ اور کئی باغوں کا نام تو لیا جاتا ہے لیکن ایک کا نشان بھی باقی نہیں ہے۔

چند بازار حسب ذیل ہیں۔

چوک - عہد آصفی کی یادگار ہے۔ اس بازار میں جواہرات۔ چاندی سونے۔ چکن۔ گوٹے اور چکن کے علاوہ ہر قسم کی دوکانیں تھیں۔ اور یہ لکھنؤ کا قدیم تجارتی مرکز ہے۔ یہ انگریزی عملداری میں بھی لکھنؤ کی تہذیب اور تمدن کا آخری مرکز تھا۔ یہ وہ مقام

ہے جہاں بیسویں صدی کے آغاز تک اِس گلستاں کے دورِ خزاں میں کبھی بہارِ گزشتہ کی جھلک آجاتی تھی۔ اب کیا عرض کروں کہ وہ جھلک بھی کیا چیز تھی۔

وزیر گنج۔ عہدِ آصفی کا بازار ہے اور قدیم باوضع اہلِ لکھنؤ کا مرکز ہے۔

یحییٰ گنج۔ نواب آصف الدولہ کے نام پہ آباد ہوا۔ اس بازار میں ہر قسم کی دوکانیں ہیں اور تجارت کا بڑا مرکز ہے خصوصیت سے یہ مسی اور برنجی ظروف کا مرکز ہے۔ تمام ہندوستان میں یہاں سے ظروف جاتے ہیں۔

سعادت گنج۔ نواب سعادت علی خان کی یادگار ہے۔ شاہی عہد میں یہ غلہ کی بہت بڑی منڈی تھی۔ اب بھی یہاں اجناس کا بڑا کاروبار ہے۔

حضرت گنج۔ یہ بازار امجد علی شاہ کی تعمیر ہے۔ انگریزی وضع کا ہے۔ یہاں بڑی بڑی دوکانیں ہیں۔ لاہور کے مال روڈ سے مشابہ ہے۔ اور لکھنؤ کی چورنگی (کلکتہ کا بہت مشہور بازار ہے جس کا ہندوستان میں جواب نہیں ہے) کہلاتا ہے

امام باڑہ نواب آصف الدولہ

اس کا نقشہ دہلی کے ایک مہندس نے تیار کیا تھا۔ یہ امام باڑہ سنہ ۱۲۰۵ھ کے عظیم قحط کی یادگار ہے جس میں آٹا روپے کا دس بارہ سیر بکنے لگا تھا اور سب اجناس کی قیمتیں بڑھ گئی تھیں۔ نواب عالی نے لنگر خانے جاری کرا دیے اور تمام ممالک محروسہ اور لکھنؤ میں غلہ

کی ارزاں دوکانیں کھلوا دیں اور اس عالی شان اور بے نظیر عمارت کی تعمیر شروع کروادی جس میں روز ہزاروں آدمی کام کرنے لگے۔ شرفاء (بلا استثنائے مذہب) جو مزدوری نہیں کر سکتے تھے اور کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے تھے ان کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ بعد غروب آفتاب جب تاریکی چھا جاتی یہ لوگ آتے اور اپنے گھر کے افراد کی تعداد کے برابر تراشی ہوئی لکھوری (چھوٹی) اینٹ ایک جگہ سے اٹھا کر چند گز کے فاصلہ پر رکھ دیتے اور فی اینٹ ایک روپیہ معاوضہ پاتے۔ اینٹ پون پاؤ یا پاؤ بھر سے زیادہ نہ ہوتی۔ لوگ اتنے سچے تھے کہ اپنے کنبہ کے افراد سے ایک اینٹ زیادہ نہ اٹھاتے۔

نواب عالی خود تعمیرات کا معائنہ کرتے اور کام بڑھانے کے لئے تعمیر کو ناقص قرار دے کر منہدم کرا دیتے۔

اس طرح امام باڑے کی تعمیر کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک قحط کی بلا دور نہ ہو گئی۔

صدر دروازہ رومی دروازہ کہلاتا ہے۔ اس میں تین راستے ہیں یہ بہت بلند اور خوبصورت ہے۔ رومی دروازہ اور امام باڑہ میں لکڑی بالکل نہیں ہے۔ اثارا ایک گز یا کچھ زیادہ چوڑے ہیں۔ اس کا وسیع ہال دنیا میں ایک ڈاٹ کا سب سے بڑا ہال ہے جسے دیکھ کر انجینئر حیران ہو گئے۔ چھت پر بھول بھلیاں ہے۔ کوئی جائے تو بغیر رہنما کے واپس نہیں آسکتا۔ غدر میں کئی گورے بڑے زعم میں چڑھ گئے تھے کچھ مر گئے اور کچھ سیڑھیاں لگا کر اتارے گئے۔

اندرونی پھاٹک کے دائیں جانب مسجد ہے۔ یہ لکھنؤ اور اودھ میں

دوسری سب سے بڑی مسجد ہے (آصف الدولہ کی ایک مسجد گورکھپور میں بھی ہے)۔

امام باڑہ کے جانب مشرق ایک باؤلی (بڑا کنواں) ہے جس میں پانی تک سیڑھیاں ہیں اور باؤلی کے اندر صحنچیاں اور کمرے ہیں جگہ گرمیوں میں بہت سرد رہتے ہیں۔

اس امام باڑہ کا کوئی وقف نہیں ہے۔ اس کا انتظام وقف حسین آباد کی طرف سے ہوتا ہے۔ قرآن خوانی کے لئے قرآن خوان مقرر ہیں صفائی اور روشنی کے لئے خدام ہیں۔

نواب کی قبر تہہ خانہ میں ہے۔ وسط ہال میں اسی مقام پر نقرئی جنگلہ لگا کر اسی طرح کی چادر اور شامیانہ نصب ہے جیسا فیض آباد کے مقبروں میں مذکور ہوا۔ سرہانے ایک نقرئی کشتی میں نقرئی گلاب پاش اور اگردان رکھا ہے۔ اور ایک گلاس کیس میں مصنوعی تاج۔

امام باڑہ میں قدآدم آئینے اور جھاڑ فانوس نواب مرحوم کے وقت کے ہیں محرم میں تبرک تقسیم ہوتا ہے اور روشنی ہوتی ہے۔

لامارٹینیر کالج

جنرل مارٹن ایک دولت مند فرانسیسی تھے۔ نواب آصف الدولہ نے گورنر جنرل کو لکھکر انکے خدمات اپنے توپخانہ کے لئے ۱۷۷۶ء میں منتقل کرا لئے۔ مارٹن مرغ بازی میں بڑے ماہر تھے۔ انہوں نے عیسائی لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک بہت بڑی اور شاندار عمارت

نوابی۔ اس عمارت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سامنے ایک بڑا تالاب ہے اور تالاب کے بیچوں بیچ سو سوا سو فٹ بلند مینار ہے جو دور دراز مقامات سے نظر آتا ہے۔

اس عمارت کی خوشنمائی اور وسعت دیکھکر نواب آصف الدولہ نے مارٹن کو ایک کثیر رقم کی پیش کش کی جسے مارٹن نے قبول نہ کیا۔ لیکن ان کو یہ اندیشہ ہوا کہ مرنے کے بعد شاید کوئی بادشاہ اس عمارت پر قبضہ کرلے چنانچہ مارٹن نے وصیت کی کہ مرنے کے بعد عمارت مذکور کے بڑے ہال کے وسط میں ان کو دفن کیا جائے تاکہ پھر کوئی بادشاہ اس عمارت کے لینے کا خیال نہ کرے۔

جنرل مارٹن نے ۱۳ ستمبر ۱۸۰۰ء کو کوٹھی فرح بخش میں انتقال کیا اور حسب وصیت اپنے کالج کی عمارت میں دفن ہوئے۔ غدر میں باغیوں نے قبر کھود ڈالی تھی۔ امن ہونے پر دوبارہ بنادی گئی اس اسکول اور کالج میں۔ یوروپین۔ اینگلو انڈین اور کم پیجین لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پاتے ہیں۔

مارٹن نے ایک بڑا وقف (ٹرسٹ) چھوڑا ہے۔ جس سے غریب طلباء اور نادار لوگوں کو وظیفے ملتے ہیں۔ اور سبکدوش ہونے والے ملازمین کو اسی طرح پنشن ملتی ہے جیسے سرکاری ملازمین کو۔

لا مارٹینیر کالج عوام میں مارٹن صاحب کی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے وظیفہ اور پنشن میں۔ ہندو۔ مسلمان۔ عیسائی کی کوئی تخصیص نہیں ہے لا مارٹینیر اسکول اور کالج فری اسکول اسٹریٹ کلکتہ میں بھی ہے

مسجد تحسین علی خاں۔ تحسین علی خاں نے چوک میں یہ عالی شان مسجد نواب آصف الدولہ کے عہد میں بنوائی۔ اس کے بلند مینار شہر کے دور دراز مقامات سے نظر آتے ہیں۔ گنبدوں اور میناروں کے کلسوں پر سونا چڑھا ہوا ہے۔

موتی محل۔ دریائے گومتی کے کنارے ایک وسیع رقبہ میں باغ کے وسط میں خوشنما عمارت ہے۔ اس کا گنبد موتی کی شکل کا ہے۔ اطراف میں خوبصورت سبزہ زار روشنیں اور پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ یہ اب بھی ایک فرحت بخش مقام ہے اور مہاراجہ بلرام پور کی ملکیت ہے جو صوبہ متحدہ کے سب سے بڑے تعلقدار تھے۔

لال بارہ دری۔ یہ شاندار دو منزلہ عمارت اپنی اصلی حالت میں ہے یہاں شاہان اودھ کی "تاج پوشی" ہوتی تھی۔ اب اس میں عجائب گھر ہے۔

شیر دروازہ۔ اس تاریخی دروازے کی چھت سے جنرل نیل کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔

بیلی گارد۔ لکھنؤ رزیڈنسی۔ اس کی تعمیر نواب سعادت علی خاں کے عہد میں سنہ ۱۸۰۰ء میں ہوئی۔ کرنل بیلی رزیڈنٹ کے نام پر اس کے صدر دروازہ (پھاٹک) کا نام بیلی گارڈ گیٹ رکھا گیا تھا۔ کثرت استعمال سے پوری رزیڈنسی بیلی گارد کہلانے لگی۔ اس کا رقبہ دو ڈھائی میل ہے سنہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں کی گولہ باری سے رزیڈنسی کی سب

عمارتیں منہدم ہوگئیں۔ دیدبان۔ دیواروں اور گمرڈی کے آثار باقی رہ گئے ہیں۔ جو انگریز یہاں مارے گئے ان کی قبریں ہیں۔ سبزہ زار اور چمن ہیں۔ سہ پہر کو لوگ سیر کے لئے آتے ہیں۔ تاریخی مقام ہونے کی وجہ سے باہر کے لوگ بھی آتے رہتے ہیں۔

شاہ نجف۔ یہ روضہ نجف اشرف کی شبیہہ ہے اور شاہ غازی الدین حیدر اور ان کی ملکہ کی ابدی آرام گاہ ہے روضہ کے اطراف مخملی سبزہ زار خوش رنگ اور خوشبودار پھولوں کی چمن بندیاں روح کو تازہ کرتی ہیں۔ روضہ کے جانب مغرب ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے۔ بہشت کا پھاٹک لب دریا ہے اس روضہ میں سب شاہی امام باڑوں سے زیادہ قیمتی سامان ہے۔ نہایت نفیس شیشہ آلات سے آراستہ ہے۔ دو دو نقرئی ضریحیں نقرئی تخت پر۔ نقرئی منبر ہے۔ ان پر نقرئی ستونوں پر زرکار شامیانے نصب ہیں اور اسی طرح کے شامیانے بادشاہ اور ملکہ کی قبروں پر ہیں۔ بادشاہ اور ملکہ کا ہر سال یہاں طعام خوش گوار تقسیم ہوتا ہے اور محرم کی طرح روشنی ہوتی ہے۔ محرم میں بہت اچھی روشنی ہوتی ہے اور تبرک تقسیم ہوتا ہے۔ قبل تقسیم محرم میں شاہی امام باڑوں کی روشنی دیکھنے کبھی لوگ کلکتہ اور بمبئی سے بھی آجاتے تھے۔ آٹھویں محرم کو سب شاہی امام باڑوں میں داخلہ پاس سے ہوتا تھا۔ اس تاریخ کو رش آتے تھے۔

روزمرہ کی صفائی اور روشنی کے لئے خدام مقرر ہیں۔ وقف کے اسلحہ بردار سپاہی حفاظت کرتے ہیں۔

نواب سعادت علی خان اور بیگم خورشید زادی کے مقبرے۔ شاہ غازی الدین حیدر نے اپنے والدین کے یہ خوبصورت اور عالی شان مقبرے بنوائے۔ دونوں ایک ہی وضع کے ہیں اور قیصر باغ سے ملحق ہیں۔ جو نسٹھ فٹ کی بلندی تک زینے گئے ہیں۔ کل بلندی سو فٹ سے زیادہ ہے اطراف میں سبزہ زار ہے۔ یہاں کی صفائی اور روشنی وغیرہ وقف شاہ نجف کے زیر انتظام ہے۔

چھتر منزل۔ لب دریا نہایت ہی خوبصورت پانچ منزلہ عمارت ہے۔ اس کے گنبدوں پر سنہرے چھتر لگے ہوئے ہیں اس کا محل وقوع اتنا دلکش اور نظارہ اتنا دلفریب ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ سامنے سبزہ زار ہے انگریزی عہد سے اس میں یونائیٹڈ سروس کلب قائم ہے۔ چھتر منزل کا ایک حصہ غدر کی گولہ باری میں منہدم ہوگیا۔ اس مقام پر اب چھتر منزل کے سامنے والی سڑک ہے

کوٹھی روشن الدولہ۔ یہ کوٹھی شاہ نصیر الدین حیدر کے وزیر اعظم نواب روشن الدولہ کی قیام گاہ تھی۔ پانچ منزل کی شاندار خوشنما عمارت ہے۔ انگریزی عہد سے اس میں ڈپٹی کمشنر اور ڈپٹی کلکٹروں کے اجلاس اور دفتر ہیں۔

جامع مسجد۔ یہ لکھنؤ اور اودھ کی سب سے بڑی مسجد ہے

محمد علی شاہ کی ملکہ۔ ملکہ جہد نے بنوائی تھی۔

حسین آباد مبارک۔ شاہ نجف سے ساڑھے تین میل اور امام بارہ آصفی سے نصف میل دور جانب مغرب واقع ہے عمارت کی خوشنمائی کے لحاظ سے یہ سب شاہی امام باڑوں سے زیادہ خوبصورت ہے حسین آباد روڈ کے جانب مشرق و مغرب ایک ہی وضع کے دو خوبصورت پھاٹک ہیں اور دو رویہ دکانیں ہیں۔ ان میں چکن اور کامدانی وغیرہ کی تجارت ہوتی ہے امام باڑہ کا صدر دروازہ اور جواب بھی ایک ہی وضع کا ہے جواب میں نوبت خانہ ہے۔ شاہی میں یہاں شہنائی بجتی تھی صدر دروازہ سے متصل مغرب کی طرف ایک چھوٹی خوبصورت مسجد ہے۔ صحن کے بیچ میں نہایت خوشنما نہر ہے جس میں کشتی پر کاٹھ (لکڑی) کے ذوالجناح کی شبیہ ہے سائیس کے ہاتھ میں لگام ہے۔ کاریگر نے کمال دکھایا ہے گھوڑے اور آدمی میں بس بولنے کی کسر رہ گئی ہے۔ جانب مغرب محمد علی شاہ کی دختر شہزادی قدسیہ بیگم کا مقبرہ ہے جو روضہ تاج محل کی نقل ہے۔ اور جانب مشرق اس کا جواب ہے امام باڑہ کا گنبد سنہرا ہے روکار کی دیواروں پر اور اندر خط طغرا میں پورا قرآن شریف لکھا ہوا ہے۔ اندر آئینے جھاڑ فانوس۔ نقرئی تخت و منبر۔ نقرئی ستونوں پر زر نگار شامیانے اسی طرح ہیں جیسے شاہ نجف میں مذکور ہوا۔ نقرئی کشتی نقرئی اگردان گلاب پاش اور مصنوعی تاج یہاں بھی ہے

وسط ہال میں محمد علی شاہ دفن ہیں۔ بادشاہ کی برسی پر طعام تقسیم ہوتا ہے۔ اور محرّم میں تبرّک۔ محرّم میں یہاں کبھی اچھی روشنی ہوتی ہے۔

وقف کے ملازم صفائی روشنی اور دیکھ بھال کرتے ہیں اور وقف کے مسلّح سپاہی پہرے پر مقرر رہیں۔

جامعہ سُلطانیہ اور مدرسہ سُلطان المدارس یہ دار العلوم حضرت امجد علی شاہ کی یادگار ہے اور وقف حسین آباد کے زیر انتظام ہے۔ شاہی میں پانچ ہزار طلباء یہاں تعلیم پاتے تھے۔ اب چند سو کی تعداد رہ گئی ہے۔

قیصر باغ۔ معماری کا ایک خوبصورت پھول تھا اور سلطان عالم کے دور میں جنتِ ارضی کا سماں پیش کرتا تھا۔ دو پھاٹک کھُد گئے اور بہت کچھ تبدیلیاں ہو گئیں۔ دو طرفہ عمارتوں کا طویل سلسلہ وسط کی بارہ دری مشرقی اور مغربی پھاٹک موجود ہیں جو لکھی دروازے کہلاتے ہیں۔ درمیان میں چمن بھی ہیں۔ وائسرائے کی آمد پر تعلقداران اودھ انہیں اسی بارہ دری میں مدعو کرتے تھے اور دربار ہوتا تھا۔ انجمن تعلقداران اودھ کے جلسے بھی ہوتے تھے۔ انگریزی عہد تک قیصر باغ کی عمارتیں تعلقدارانِ اودھ کی سکونت کے لئے مخصوص تھیں۔ یہ مقام اب بھی بڑے بڑے جلسوں۔ کانفرنسوں کے لئے دُنیا بھر کی عمارتوں سے زیادہ کارآمد ہے اس لئے کہ ایسی وسیع اور کشادہ جگہ

کہیں نہیں مل سکتی کہ بارہ دری میں اجلاس ہوں اور آمنے سامنے کی عمارتوں میں مہمان ٹھہرائے جائیں جن میں ہزاروں مہمان بھی آسانی سے ٹھہر سکتے ہیں۔

بنارسی باغ- یہ باغ سلطان عالم کی یادگار ہے جو اُس زمانہ میں فردوس بریں کا نمونہ تھا- اب نہ وہ وجد آفریں باغ ہے نہ وہ لالہ زار نہ وہ چمن- سب رفتار زمانہ کے ہاتھوں پامال ہو گئے۔ باغ کے وسط میں سنگِ مرمر کی بارہ دری باقی ہے جو کبھی جواہرات سے مزین تھی اب کہیں کہیں عقیق نظر آتے ہیں۔ بارہ دری کے اطراف میں مخملی سبزہ زار ہیں۔ شام کو لوگ سیر کو آتے ہیں۔ آنجہانی سر ہارکورٹ بٹلر گورنر صوبہ جات متحدہ جو لکھنؤ کے شیدائی تھے ان کے دورِ حکومت میں لکھنؤ میں بہت کچھ ترقیاں ہوئیں سنہ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے اس باغ کے وسیع رقبہ میں زندہ جانوروں کا عجائب خانہ بنوایا اور پرنس آف ویلز زولوجیکل گارڈن نام رکھا۔

سکندر باغ- باغ اور اس کے وسط میں محل سلطان عالم نے اپنی ایک ملکہ نواب سکندر محل کے لئے بنوایا تھا۔ باغ کا ایک حصہ باقی ہے۔ محل کی سب عمارتیں غدر میں تباہ و برباد ہو گئیں اس لئے کہ یہاں بڑی سخت لڑائی ہوئی تھی اور یہاں سے پانچ میل مغرب تک میدانِ کارزار گرم تھا محل کے پھاٹک اور چہار دیواری کے کچھ آثار باقی ہیں- انگریزی

عہد میں یہاں پھلوں پھولوں اور آنبہ کے قلم اور پودوں کی تجارت ہوتی تھی۔ گئی گذری حالت میں بھی تفریح کی اچھی جگہ تھی۔ لوگ سہ پہر سے شام تک آتے رہتے تھے۔

سنہری مسجد۔ نادان محل میں شاہی زمانہ کی ہے۔ اس کے بھی گنبدوں اور میناروں کے کلسوں پہ سونا چڑھا ہے۔

تصویر والی بارہ دری۔ حسین آباد پارک میں شاہی کا ایک تالاب ہے۔ اس کی سطح پہ چار اندھے (بڑے) کنوئیں ہیں جن سے ہر وقت پانی جاری رہتا ہے۔ اور تالاب کبھی خشک نہیں ہوتا۔ بالائے آب دو منزلہ بارہ دری ہے دوسری منزل کے ہال میں شاہانِ اودھ کی قدِ آدم قلمی تصویریں (OIL PAINTINGS) ہیں اور دیکھنے کے قابل ہیں۔ سلطانِ عالم کی تصویر میں مصوّر نے یہ خوبی دکھائی ہے کہ جس رُخ سے دیکھئے معلوم ہوتا ہے تصویر بھی اُسی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس تصویر پہ سبز مخمل کا پردہ پڑا رہتا ہے۔

حسین آباد کا گھنٹہ گھر۔ اس کی تعمیر وقف حسین آباد سے ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۷ء تک ہوئی۔ تصویر والی بارہ دری کے قریب حسین آباد پارک میں ہے۔ یہ ہندوستان میں سب سے خوبصورت اور سب سے بڑا گھنٹہ گھر ہے جو شہر اور مضافات کی تمام اونچی عمارتوں سے نظر آتا ہے۔ اس کی مشین بنسن کمپنی

لندن کی بنی ہوئی ہے۔ ہر پندرہ منٹ میں گھنٹہ بجتا ہے۔

اکبری دروازہ - چوک میں شہنشاہ اکبر کے عہد کی یادگار ہے۔ یہاں اچھی چہل پہل رہتی ہے۔

ٹیلہ والی مسجد - شہنشاہ عالمگیر کے زمانہ میں تعمیر ہوئی یہ ایک بلند مقام پر واقع ہے۔ اس کا محل وقوع اور لب دریا ہونے کی وجہ سے نظارہ بڑا دلکش اور قابل دید ہے۔ مسجد کے سامنے قریب سات سو برس کا قدیم ایک بزرگ شاہ پیر محمد صاحب کا روضہ ہے اور اسی سبب سے یہ شاہ پیر محمد صاحب کا ٹیلہ کہلاتا ہے لکھنؤ میں سب سے بڑی نماز جمعۃ الوداع اسی مسجد میں ہوتی ہے۔ لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا مجمع ہوتا ہے۔

بوقت انتزاعِ اودھ لکھنؤ میں باون ۵۲ شاہی محل اور چھپن ۵۶ شاہی باغ تھے۔

شاہی اوقاف

نواب بہو بیگم کی فیاضی اور حوصلہ کی نظیر ہندوستان کیا دنیا میں نہیں ہے۔ انہوں نے کئی کروڑ روپیہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس لئے دیا تھا کہ اس کا منافع ان کے اعزا اور ملازمین اور ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسل ملتا رہے۔ اور دیگر امور خیر میں صرف ہو۔

ابتدا سے لے کر اب تک لاکھوں بندگانِ خدا کو فیض پہنچایا ہے اور ابھی تک لاکھوں روپیہ ماہوار تقسیم ہوتا ہے۔ شیعہ سنی۔ ہندو حتیٰ کہ سقّے خاکروب وغیرہ تک اس سے مستفیض ہوتے ہیں۔

یہ بہو بیگم کا وثیقہ کہلاتا ہے اور شاہی اوقاف کا سب سے بڑا وقف ہے۔

وقف شاہ غازی الدین حیدر

شاہ نجف

ایک کروڑ روپیہ جوان سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے قرض لیا تھا اس کا منافع تین لاکھ روپے سالانہ ہے جو جملہ امور خیر کے علاوہ بادشاہ اور ملکہ کی بہبی۔ محرّم۔ شاہ مرحوم اور ان کے والدین کے مقبروں کی نگرانی اور حفاظت میں صرف ہوتا ہے۔ اسی وقف سے پانچسو روپیہ مہینہ حضرت گنج کے گرجا کو دیا جاتا ہے جو شاہ مرحوم کی یورپین بیوی ملکہ مریم زمانی کے بھائی نے تعمیر کیا تھا۔

وقف شاہ نصیر الدین حیدر

اس کی آمدنی سے وکٹوریہ گنج کے ایک انگریزی شفاخانہ کے اور ایک یونانی دارالشفاء چوک کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔

وقف محمد علی شاہ
حسین آباد مبارک

غالباً اس کی آمدنی بھی تین لاکھ ہے۔ ہر سال چالیس زائرین حج و زیارت کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ بادشاہ کی برسی اور اخراجات ہوتے ہیں۔ مقبرہ پر دیکھ بھال کے لئے خدام ملازم ہیں۔ غریب شرفاء اور خاندان شاہی کے درما ہے مقرر رہتا ہیں۔

کل شاہی اوقاف کا انتظام ایک مسلمان ڈپٹی کلکٹر کے زیر نگرانی انجام پاتا ہے اور ارکان خاندان شاہی اپنا ایک نمائندہ منتخب کرتے ہیں جو متولی ہوتا ہے۔

لکھنؤ کی تہذیب و تمدن

سلطنت اودھ کی تباہی کے بعد لکھنؤ کی عام تہذیب و تمدن پر بہت بڑا اثر پڑا بالخصوص مسلمانوں پر حالانکہ اہل ہنود بھی اس میں شریک تھے۔ ان کی بڑی تعداد اہل زبان تھی اور بعض نہایت قابل تھے لیکن جب انھوں نے ہوا کا رخ بدلا ہوا دیکھا تو خود بھی وہی رخ اختیار کیا اس لئے مالی اعتبار سے وہ زیادہ نقصان میں نہیں رہے باوجود بدلے ہوئے حالات کے ان کی

مادری زبان اُردو ہی رہی۔ انگریزی عہد میں ان میں ممتاز اُدباء و شعراء گزرے ہیں۔

کہنے کو جو بھی کہا جائے اب بھی وہاں ایسے بے شمار خاندان موجود ہیں جن کی زبان اُردو ہے اور اُردو بولتے ہیں۔ ہندو شعراء اُدباء اب بھی ہیں۔

پُرانے اور ممتاز شعراء میں پنڈت آنند نرائن مُلّا سابق جج ہائی کورٹ خلف آنجہانی پنڈت جگت نرائن مُلّا منسٹر صوبہ متحدہ ساکن گولہ گنج لکھنؤ بقید حیات ہیں جن کا گھر بھر فصیح اُردو بولتا ہے اور جناب فراق گورکھپوری۔ پنڈت جواہر لال نہرو آنجہانی بھی صاف اور شستہ اُردو بولتے تھے۔

قبل تقسیم مشاعروں وغیرہ کی مخلوط محفلیں لکھنؤ کے قدیم تمدن کی یاد دلا جاتی تھیں۔

جب تقسیم کا اعلان ہوا اور ہندی کے چرچے ہونے لگے تو اہلِ ہنود کو یہ کہتے سنا گیا کہ اب اس عمر میں ہندی پڑھیں۔

زمانہ شاہی کے مسلمان جو خوش حال اور فارغ البال تھے اُنہوں نے بدلے ہوئے حالات کا زیادہ اثر نہ لیا اور بدستور عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ان کی اولاد ان کی تقلید کرتی رہی کسب معاش کی طرف توجہ نہ کی۔ نسلیں بڑھتی گئیں۔ آباء و اجداد جو کچھ چھوڑ گئے تھے وہ رفتہ رفتہ ختم ہوتا گیا۔ لاتعداد عالی نسب اور ذی عزت خاندان تباہی کا شکار ہو گئے آنکھیں اُس وقت کھلیں جب وقت گذر چکا تھا۔ مالی انحطاط سے زندگی جتنی بھی متاثر ہو وہ کم ہے

نہ وہ صحبتیں رہ سکیں نہ وہ علم و ادب کی محفلیں۔ یہی سبب ہے کہ لکھنؤ اور اودھ کی مسلم تہذیب رو بہ زوال ہوتی چلی گئی ورنہ اس سے کہیں زیادہ ہوتی جو قبل از تقسیم تک تھی۔

یہ غلط ہے کہ اہلِ لکھنؤ اور اودھ نازک مزاج ہوتے ہیں اور وہ دنیا میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہیں دے سکتے۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء میں جو کارنامے انجام دیئے وہ ناظرین طالع فرما چکے ہیں۔ دراصل یہ لوگ صلح پسند اور سنجیدہ رہے۔ درگزر اور نظر انداز کرنا ان کا شعار رہا البتہ نفاست پسند ضرور رہے۔ نفاست بغیر نزاکت آ ہی نہیں سکتی۔ نفاست کے ساتھ نزاکت لازمی ہے۔ طور طریقوں۔ عادات اطوار۔ طرز معاشرت غرضکہ ہر بات میں ان کی نفاست نمایاں نظر آئے گی۔ دوسرے الفاظ میں اس کو شعور اور سلیقہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

ضروری نہیں کہ بجز لکھنؤ اور اودھ کے یہ خوبیاں کہیں اور نہ ہوں۔ اگر کسی مقام پر ہوں بھی تو شاذ و نادر ایک ہی کنبہ میں ہوں گی عام نہ ہوں گی۔ جو گئے گزرے زمانہ قبل تقسیم تک وہاں تھیں وہ تہذیب وہ شائستگی وہ زبان اب کہاں نصیب ہو سکے گی۔

زندگی سے وابستہ تمام امور اور رسم و رواج میں اہلِ لکھنؤ کی ایک نمایاں اور امتیازی خصوصیت رہی ہے۔

بے محل نہ ہوگا اگر اختصار کے ساتھ تمدنی اعتبار سے وہاں کے محرم کا تذکرہ کر دیا جائے۔

ہندوستان میں شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ محرم کی ابتدا

بیجاپور۔ گول کنڈہ اور احمد نگر سے ہوئی۔ اس کے مدت دراز کے بعد مرشد آباد میں نواب علی وردی خان ناظم بنگال۔ بہار واڑیسہ کے عہد میں اور فیض آباد میں نواب سعادت خان برہان الملک کے عہد میں شاہی اہتمام سے از سر نو آغاز ہوا۔

۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی کے بعد نظامت مرشد آباد پر زوال آیا لیکن فیض آباد لکھنؤ اور اودھ میں محرم کو ایسا فروغ ہوا کہ عوام بلکہ اہل ہنود تک دل چسپی لینے لگے۔

رسومات محرم میں اس خوش اسلوبی سے ایسی دل کشی۔ خوش نمائیاں۔ جدت طرازیاں۔ نفاستیں اور پاکیزگی پیدا کی گئی اور ایسا پرسوز اور سوگوار بنا دیا گیا کہ لٹتے پرانے واقعہ کو تازہ غمی میں تبدیل کر دیا گیا۔ دنیائے اسلام میں ایسا محرم کہیں نہیں ہوا۔ زمانہ شاہی کا تو کہنا ہی کیا۔ عہد انگریزی میں امام باڑوں کی نفیس اور پاکیزہ سجاوٹ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ناریل۔ پستہ۔ بادام اور چھالیہ سے مختلف اقسام کے نہایت خوشنما گوٹے (مسالے) بنائے جاتے تھے۔ شاہی زمانہ میں بعض لوگ بجائے پان کے قہوہ (کافی) کے بھونے ہوئے بیج کھاتے تھے جو بہت تلخ ہوتے ہیں لیکن شب بیداری کے لئے مفید بعض آراستہ سبیلوں پر زعفران کا شربت اور مختلف اقسام کے شربت تقسیم ہوتے تھے جن میں پستہ و بادام کی ہوائیاں ہوتی تھیں۔

مصنف کتاب ہذا